غالب
فخرِ روزگارِ دلّی
ڈاکٹر رفیع رؤف

○ سنہ اشاعت ۱۹۸۸ء

○ طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار (حیدرآباد-۲) اے پی

○ کتابت :- محمد عبدالقادر، سنتوش نگر اولڈ
مکان نمبر (17-1-260/2)

○ تعداد :- پانچ سو

○ سرورق :- قیصر سرمست

قیمت Rs. 40/-

ملنے کے پتے :-

مصنف کے مکان نمبر (9-4-86/49) سالار جنگ کالونی

حیدرآباد (500008) اے پی

اُردو ہال بک ڈپو گلشن حبیب، اردو گلی حمایت نگر حیدرآباد (اے پی)

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

مطلعِ تحریر

مغل دورِ تہذیب صرف ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ تاریخِ عالم میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں فنِ تعمیر، موسیقی، مصوری، شعر و ادب اور منظم مرکزی حکومت کی شکل میں صورت پذیر ہوئی تھیں۔ عروج کے زمانے میں اس تہذیب کا ہر گوشہ بساطِ دامانِ باغباں اور کفِ گل فروش تھا۔ جس دور سے غالب کا تعلق رہا ہے وہ نشاطِ زندگی سے بہرہ ور تھا لیکن جب حالات بدل گئے تو مغلوں کے ایوانِ تہذیب و تمدن غالب کے اس شعر کی تفسیر بن گئے ؎

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

غالب جب آگرے سے ہجرت کر کے دلّی آ بسے تو دلّی سے وابستگی ان کے نام و نمود اور شہرت و مقبولیت کا باعث بنی اور آج جب کہ وہ مغلیہ دلّی قصّہ پارینہ بن گئی تو غالب کی شخصیت، دلّی کے طرفِ کلاہ کا وہ سب سے بیش قیمت جواہر قرار پائی جس کے واسطے سے دلّی کا دورِ رفتہ جگمگا رہا ہے۔ غالب کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کے نگار خانے میں دلّی کے تہذیبی مرقعے تلاش کئے جا رہے ہیں اور ان ہنگاموں کی گونج چار دانگ عالم میں سنائی دے رہی ہے جن پر کبھی شہر دلّی کی ہستی کا انحصار تھا، یعنی لال قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا ہر ہفتہ

سیر جمنا کے پل کی ہر سال میلہ، پھول والوں کا ان میں ہر چیز دلی کی کتاب تہذیب کا ایک ایک باب ہے اور جب یہ نہیں رہے تو پھر غالب کی نظر میں دلی، دلی کہاں تھی مگر انہی کی ذات سے آج ان سب ہی دھندلائے نقوش میں ازسرِنو جان سی پڑ گئی ہے۔

غالب کی وضع قطع، طرزِ بود و ماند، ان کا حلقۂ احباب، ان کی مجلسی زندگی ان کے شاگردوں کی کثرت، دربار سے وابستگی، ان کی حویلی، محل سرا، پوتے، خادم ان سب کی جیتی جاگتی تصویریں ان کے مکتوبات کے آئینہ خانے میں جلوہ فگن ہیں اور ان سب کی تہہ میں دلی کی معاشرتی قدریں کارفرما نظر آتی ہیں۔ شہر دلی کی سماجی زندگی، رسم و رواج، روایات و تہذیب، معاشرت، و مذہب وغیرہ کے بکھرے بکھرے سہی مگر بڑے تیکھے نقوش ان میں ملتے ہیں اگر ان نقوش کو جوان کی شاعری میں بھی اشاروں اور علامتوں میں سمٹے ہوئے ہیں، پھیلا دیا جائے تو غالب کے عہد کی بڑی دلکش و دلآویز اور جامع تصویر بنتی ہے۔ اور اسی کی مدد سے ہم اس دور کے اقدار کے تضاد و تصادم اور اس عہد کی شکست و ریخت کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں جو غدر کے ہنگاموں کی دین تھے "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا مفہوم بھی غالب کے مطالعہ سے ہی سمجھ میں آتا ہے۔

غرض ہم غالب کو دلی کی مشترکہ تہذیب کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔

غالبیات کے ایوان میں تحقیق و تصنیف کے جوگراں بار ذخیرے جمع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور آنے والے ادوار میں ہوتے رہیں گے ان میں اس چھوٹی سی کتاب کی شمولیت سمندر میں ایک قطرے سے بڑھ کر تو نہیں لیکن اگر یہ کتاب ہماری اس نئی پود میں جو غالب اور اقبال کے نام سے تو آشنا ہے لیکن فکر و آگہی کو اپنی دسترس سے باہر سمجھتی ہے اور کوشش و سعی سے گریز کرتی ہے، اسی نسل کے آہوان رم خوردہ کی وحشت میں کمی کا باعث بن سکے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

غالب کا مطالعہ درحقیقت ہندوستان کی اس مشترکہ تہذیب کا

مطالعہ ہے جو ہماری تاریخ کی کوئی ایک ہزار سالہ کاوشوں کا حاصل ہے۔

جدید ہندوستان کے ایک عظیم معمار کے الفاظ میں۔

"ایک عظیم شاعر کی عظمت کو اس سے بہتر خراج کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تخلیقات کی روشنی میں نئی نسل اپنی تہذیب کی سمتیں متعین کرے۔[1]"

رفیع رؤف
شعبۂ اردو نظام کالج
جامعہ عثمانیہ

---

[1] آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی جی۔ پیغام برائے غالب نمبر رسالہ شاعر ۱۹۶۹ء خصوصی اشاعت بضمن غالب صدی۔ اقتباس۔ صفحہ ۔ ۱۹

(۱)

غالبؔ معاصرین اور ناقدین کی نظر میں

"ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں"

غالب انیسویں صدی کا وہ گوہرِ شب تاب ہے جس کا قدرت کے ہاتھوں ایسے وقت ظہور ہوا جب ہندوستان میں مغلوں کے سطوت و جلال کا آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ یعنی فکرِ اقبال کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مہم آزما قوم کی شانِ جلالی کے اتمام کا وقت آپہونچا تھا مگر شانِ جمالی کا ظہور ہنوز تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا گویا گزرے ہوئے طوفان کے آخری بادل، دلّی کی سرزمین پر علم و فضل کا مُن برسا رہے تھے۔ مذہبیات ہو کہ ادبیات ہر میدان میں کھڑی فصلیں لہلہا رہی تھیں خاص طور پر اُردو کا شعری ادب اپنے نصف النہار پر تھا اور غالب اس کا حاصل تھے۔ چنانچہ آج جن چیزوں کو مغلوں کی عظمتِ رفتہ کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے وہ ان کے تمدنی و تہذیبی آثار اور علوم و فنون کے شاہکار ہیں۔ اُردو کے ممتاز انشاء پرداز اور منفرد مرقع نگار رشید احمد صدیقی نے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان بصیرت افروز الفاظ میں کیا ہے۔

"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ اردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے۔ ان تینوں میں ہندوستان کی صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں" [۱]

---

[۱] رشید احمد صدیقی۔ مضمون "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" نقدِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد صفحہ (۳۱۶)

قدرت کی کرشمہ سازی کی اس سے عمدہ مثال کیا ہو سکتی ہے کہ کل تک جس شاعر کو اپنے عہد کے باکمال سخنوروں سے سکوت سخن شناس کا گلہ رہا اور وہ بار بار یہ صلائے عام دیتا رہا کہ ؎

"مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست"[1]

آج اس کے کلام اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے آگہی نے سو جتن سے دام شنیدن بلکہ فہمیدن بچھا رکھے ہیں۔ یوں تو غالب کی اس کے اپنے زمانے میں بھی کچھ کم قدر نہیں ہوئی۔ لیکن حالی کے الفاظ میں۔

"یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اس پیر ازل کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لے کر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار آئی تھی سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیئے یا جلال الدین اکبر کرتا یا جہانگیر و شاہجہاں مگر جس قدر اس اخیر دور میں ان کو مانا گیا اس کو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیئے"[2]

خود غالب کا بھی اپنے بارے میں یہی خیال تھا ؎

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

معاصرین غالب میں جنھوں نے غالب کے مرتبے کو جانا اور ان کے کلام کی فلسفیانہ تہ داری کا اندازہ لگایا ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، جن کے علمی تبحر کا ایک زمانہ قائل تھا۔ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے غالب نے اپنے دیوان ریختہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بیشتر اشعار کو قلم زد کر دیا۔ غالب کے مرتبہ شناسوں میں مصطفیٰ خاں شیفتہ کا نام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، جن کے ذوق شعری اور نظر انتقاد کے خود غالب

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی، یادگار غالب، حصہ دوم صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ ۱۸۹۷ء
[2] خواجہ الطاف حسین حالی یادگار غالب حصہ اول صفحہ ۳۶۲

بھی قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ جب تک مصطفےٰ خاں میرے شعر کی داد نہ دیں میں اس کو اپنے دیوان میں شامل نہیں کرتا ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوانِ غزل، تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد[1]

شیفتہ اگرچہ خود فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے لیکن غالب سے نسبت تلمذ رکھنے پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تذکرۂ گلشن بے خار میں غالب کے فن کو حسب ذیل الفاظ میں سراہا ہے۔

"ان کی غزل نظیری کی غزل کی طرح اور ان کا قصیدہ عرفی کے قصیدے کی طرح دلپذیر ہے۔ مضامینِ شعر کی فہم ان کو جیسی ہونی چاہئے حاصل ہے اور جملہ نکات اور لطائف سے واقف ہیں۔ یہ ایک فضیلت ہے جو صرف بعض اہلِ سخن کے ساتھ مختص ہے ۔ ۔ ۔ مختصر یہ کہ ایسا نکتہ سنج نغز گو کم دیکھنے میں آیا ہے۔"[2]

سرسید تو غالب کے عقیدت مندوں میں تھے۔ اپنی تصنیف آثار الصنادید کے باب "سخنورانِ دلی" کے تذکرے میں انہوں نے غالب کا نام سرِ فہرست رکھا ہے اور بڑے والہانہ انداز میں غالب کی شخصیت کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

"میں اپنے اعتقاد میں ان کے حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔"[3]

مفتی صدرالدین آزردہ جو عربی و فارسی میں اپنے عہد کے متبحر عالم گردانے جاتے تھے،

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالیؔ یادگار غالب حصہ اول صفحہ ۱۰۵ مطبوعہ ۱۸۹۷ء

[2] مصطفےٰ خاں شیفتہ گلشن بے خار مترجم محمد احسان الحق فاروقی ص ۳۳ مطبوعہ ۱۹۶۲ء

[3] سرسید احمد خاں آثار الصنادید باب سخنوران دلی صفحہ ۵۹ مطبوعہ ۱۹۶۵ء

شعر گوئی کا بھی ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ اپنی علمی فضیلت کی بنا پر اس عہد کے اعلیٰ ترین عہدے صدر الصدور پر فائز تھے اور دلی کالج کی انتظامی کمیٹی میں انھیں ممتحن کی حیثیت حاصل تھی۔ مفتی صاحب گو غالبؔ کی اس وقت پسندی سے متفق نہیں تھے جو انہوں نے طرزِ بیدل کی تقلید میں اپنائی تھی لیکن فارسی ادب دانش میں غالب کے فضل وکمال کے دل سے قائل تھے جس کا ثبوت یہی ہے کہ دلی کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے ان کے تجویز کردہ منتخب اصحاب میں ایک نام غالب کا بھی تھا

محمد حسین آزاد کا طرز انتقاد دورِ جدید کے نقادوں کی نظر میں خواہ لاکھ غیر معتدل اور غیر معتبر سہی لیکن آزاد نے اپنے مخصوص و منفرد لب ولہجہ میں جو بات غالب کے تعلق سے کہی تھی وہ آج بھی اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ غالب کے فن نے آزاد جیسے طرف دارِ ذوق سے بھی اپنا لوہا ان الفاظ میں منوا لیا۔

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس قدر ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعرا ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہونچ سکتے" [۱]

ادبیات غالب کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب شناسی کا موجودہ دور جہاں ایک طرف غالب کی شخصیت کے نفسیاتی تجزیہ اور ان کے فن کو جدید اصول

---

[۱] محمد حسین آزاد - آب حیات - صفحہ (۵۱۴)

تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کا دور ہے دہیں دوسری طرف غالب کی معنی آفرینی دانشِ عصرِ حاضر کے حق میں ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔ اس قسم کی تلاش و تحقیق میں ادیب اور نقاد کہیں کہیں افراط و تفریط کا شکار بھی ہوئے ہیں اور کہیں کہیں تنقید نے اپنے منصب و مقام سے ہٹ کر جانبدارانہ تنقیص و نکتہ چینی کا رنگ بھی اختیار کر لیا ہے۔[۱]

---

[۱] اس کی عمدہ مثال کوثر چاندپوری کی تصنیف "جہانِ غالب" ہے اگرچہ کوثر چاندپوری کا تنقیدی قد و قامت اس معیار کا نہیں کہ غالب شناسوں میں انھیں جگہ دی جائے مگر برسبیل تذکرہ ان کی تصنیف کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنا بھی ضروری ہے۔ یوں تو اس کتاب کے ہر باب میں غالب کی شخصیت کو کسی نہ کسی عنوان سے ہدف تنقید بنایا گیا ہے لیکن ایک مستقل باب "غالب کی اخلاقی کمزوریاں" کے عنوان سے شامل ہے جس میں غالب کی ایسی بہت سی خصوصیات جنھیں حالیؔ نے یادگار غالب میں سراہا ہے ــــــــــــ

ــــــــــــ لطف کی بات یہ ہے کہ وہی خوبیاں کوثر چاندپوری کی نظر میں غالب کی داغ دار سیرت قرار پاتی ہیں ان کی نظر میں غالب کی داد و دہش، ملازمین و متوسلین کی پرورش درباری ملازمین کو انعام و اکرام کا دینا یہ سب غالب کا ظاہری خول ہے جس میں غالب کی امارت پسندی اور نمود و نمائش کا بُت چھپا ہوا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے غالب کی نسبت سے نام آوری کے رجحان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"غالب کی زندگی میں اس سے زیادہ قابلِ اعتراض واقعات بھی ملتے ہیں جو ان کی شخصیت اور کردار دونوں کے لئے ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی عظمت صرف فن تک محدود تھی وہ جتنے بڑے فن کار تھے اتنے ہی بڑے انسان نہیں تھے۔ جو لوگ ان کے فن کی رنگینیوں، نزاکتوں اور جدتوں سے متاثر ہیں وہ ان کی سیرت کردار کا آئینہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ (کوثر چاندپوری جہانِ غالب صفحہ ۹۲)

۲

ابتدائی نقوش

چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

غالب کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں تین اہم عوامل یعنی ترک نژادی، تلمیذ الرحمانی اور فارسی دانی کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ یہ گویا ان کی شخصیت کے ارکانِ ثلاثہ تھے جن پر غالب کو آخری سانس تک فخر رہا ہے اور جو آج تک کلی طور پر محققانِ غالب کی دسترس میں نہیں آسکے ہیں۔ غالب کی زندگی کے بعض اہم گوشے جن سے حالی کو سرسری گزرنا پڑا آج بھی محققین کی نظروں سے اوجھل ہیں جیسے غالب کا نسب نامہ، ان کی ابتدائی تعلیم، آگرے سے ہجرت اور دلی میں مستقل سکونت پذیری کے اسباب و علل تاہلی زندگی سے غالب کی عدم دلچسپی وغیرہ یہ اور ایسے اہم گوشے جن کے تعلق سے اکثر و بیشتر سوانح نگاروں کو قیاس ہی پر انحصار کرنا پڑا ہے اور ظاہر ہے محض قیاس کے بل بوتے پر غالب کی شخصیت میں تلاش کی جانے والی کمزوریاں بھی قیاسی ہی متصور ہوں گی جب تک کہ وہ پایہ تحقیق کو نہ پہونچ جائیں۔

یقیناً غالب کی عظمت اور بڑائی اس میں نہیں کہ انھیں بشری کمزوریوں سے مبرا بتایا جائے بلکہ ان کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا راز ہی اس شخصیت میں پنہاں ہے جس میں لغزشیں بھی ہیں اور کمزوریاں بھی لیکن اس میں جھول اس لئے نظر نہیں آتا کہ انہوں نے اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا خود آپ محاسبہ کیا ہے [۱]

---

[۱] "میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں (سلسلہ صفحہ ۲۰ پر)

اگر اس عہد کے پس منظر کا تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ غالب کی کمزوریاں دراصل اس معاشرے کی کمزوریاں ہیں جن کے وہ نمائندہ تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حسن کے تجزیاتی مطالعہ کا حسب ذیل اقتباس قابل ذکر ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ اس روشن خیالی اور بصیرت افروز سماجی شعور کے باوجود غالب نے قدیم تہذیبی اقدار سے اپنا رشتہ نہیں توڑا، مغلیہ تہذیب کی اس ٹمٹاتی شمع کی روشنی میں بھی انھیں اس عظیم الشان تہذیب کی ہر جھلک حسین نظر آتی تھی۔ ان کے ارمان اور ان کی کمزوریاں اس جاگیرداری سماج میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے امیرزادے کے ارمان اور کمزوریاں تھیں۔ دربار میں کرسی ملے، خطابات اور القاب نام کا جزو بنیں، پنشن کی بازیافت ہو، ہم چشموں میں عزت حاصل ہو، ہوادار سے اتریں تو پیشوائی کو کوئی نہ کوئی حاضر ہو مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنا رشتہ ان طبقوں سے وابستہ کر رکھا تھا جو نئی تہذیب کی آمد آمد کے نقیب تھے۔ اس اعتبار سے وہ ان سرسید کے پیشرو تھے جنھوں نے تہذیب الاخلاق اور ایم۔اے۔او کالج کے ذریعہ قوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی۔ امیرزادے کی حیثیت سے انھیں دکھ تھا کہ ایسی حسین تہذیب مٹ رہی ہے۔ مگر اس طبقے سے رشتہ استوار رکھنے کی بناء پر جانتے تھے کہ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور اسے ناگزیر جاننے کے باوجود مستقبل کے لیے

(سلسلہ صفحہ ۱۹ سے) انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں... ہاں اتنی بات اور ہے کہ... شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں"۔ مرزا غالب اردوئے معلّیٰ مکتوب بنام مرزا علاء الدین احمد خاں ص۔ (۴۲۶)

خواب دیکھنے سے باز نہیں آئے جن کی تعبیر میں شاید ان جیسے امیرزادوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا"۔[1]

سچ تو یہ ہے کہ غالب کی شخصیت کے تانے بانے ان مخصوص سوانحی حالات سے تیار ہوتے ہیں جن کا تعلق آگرے اور دلّی کی زندگی سے ہے۔ اس کا احوال زیادہ دستیاب نہیں بجز ان چند مکتوبات میں کہ انہوں نے ضمناً کچھ سوانحی حالات کا تذکرہ کیا ہے[2] یا پھر مہر نیم روز کا دیباچہ جس میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ درباری تمدن کے تقاضوں کے مدنظر اپنے آباؤ اجداد بلکہ اسلاف کے کارناموں کی گنجائش نکال لی ہے۔ یہی وہ اہم ماخذات ہیں جن کی مدد سے حالی سے لے کر عصر حاضر تک کے سوانح نگار غالب کے حالات زندگی قلم بند کرتے چلے آرہے ہیں۔

غالب کو اپنے ترک ایبک ہونے پر آخر دم تک فخر رہا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں جابجا کیا ہے۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کے نام ایک مکتوب میں اس امر کا دعویٰ بھی ملتا ہے کہ

"میرا ہم قوم میرا ہمسر قلمرو ہند میں نہیں"۔[3]

ترک نژاد غالب کو اپنی وجاہت پر بھی بڑا ناز تھا۔ جو سراپا انہوں نے اپنے قلم سے کھینچا ہے اس کے خدوخال غمازی کرتے ہیں کہ مرزا ایک تازہ وارد تورانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ مرزا حاتم علی مہر سے بہ لہجۂ ترکانہ مخاطب ہیں۔

"بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کرتے تھے"۔[4]

---

[1] ڈاکٹر خمر حسن۔ مضمون غالب اور عہد غالب ماہنامہ آجکل دسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ (۱۷) [2] مرزا غالب اردوئے معلیٰ مکتوب بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا ملاحظہ ہو صفحہ (۳۰) [3] مرزا غالب۔ عود ہندی۔ مکتوب بنام انور الدولہ سعد الدین خاں شفق صفحہ (۴۷) [4] مرزا غالب اردوئے معلیٰ۔ صفحہ (۲۴۷)

مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ایک تصویر سے جو خاکہ کھینچا ہے اس سے بھی غالب کی وضع قطع کا اندازہ ہوتا ہے۔

"مرزا نوشہ کی عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش شہر آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا ہے۔ موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں ڈاڑھی بھری ہوئی ہے مگر گھنی نہیں ہے سر منڈا ہوا اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے ایک بر کا سفید پیجامہ سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ" [۱]

مرزا کے خطوط ہی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کی زندگی ابتدائی ایام ہی سے حوادث کا شکار رہی ہے۔ خود ان کے دادا قوقان بیگ مغلوں کے دور انحطاط میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے اور دلی میں شاہی فوج کے ایک معزز عہدے پر فائز ہو کر یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ لیکن ان کے دونوں لڑکوں عبداللہ بیگ اور نصراللہ بیگ کو تلاش معاش کی غرض سے آگرے منتقل ہونا پڑا عبداللہ بیگ کی شادی آگرے کے ایک رئیس خاندان میں ہوئی۔ یہیں غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ہجری مطابق یکشنبہ ڈسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے چنانچہ اکبر آباد غالب کا مولد ہے [۲]

غالب نے جب ہوش سنبھالا تو مستقبل کی بے یقینی اور حال کی بے ثباتی کا ماحول تھا۔ چھ سال کی عمر میں باپ

---

[۱] مرزا فرحت اللہ بیگ۔ مضامین فرحت۔ صفحہ (۱۴۹)

[۲] سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ کلیات غالب فارسی۔ جلد اول۔ مجلس ترقی ادب لاہور ماخوذ۔ صفحہ (۱۱)

کے سایہ عاطفت سے اور نو سال کی عمر میں چچا کی مشفقانہ سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ ایسے میں ان کی خوش حال اور صاحب ثروت ننھیال ہی ان کی سرپرست و مربی رہی۔ غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرے کے عمایدین سے تھے۔ آگرے میں ان کی خاصی جائداد تھی۔ منشی شیو نرائن رئیس آگرہ کے نام غالب کے ایک مکتوب سے ان کی نوعمری کے کچھ حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم۔ مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا عہد نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پر دادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور

انہوں نے جو کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار
میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس
امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری
کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید
منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے
ہوں یا چھوٹے ہوں اُنیس بیس برس کی
میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج
اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات
گزر جاتی ـــ چونکہ گھر ان کا بہت دور
نہ تھا اِس واسطے جب چاہتے تھے چلے
جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے
مکان میں بچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے
دو کٹڑے درمیان تھے ـــ ہماری بڑی
حویلی وہ ہے جواب لکھی چند سیٹھ نے
مول لی ہے ـــ اسی کے دروازے کی سنگین
بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس
اس کے کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ
کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل
سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے

آگے بڑھ کر ایک کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا
مشہور تھا اور ایک کٹڑا کہ وہ کشمیرن والا
کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے
پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ
سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔" ۵؎

یہ مکتوب جہاں غالب کے ابتدائی ایام کی آسودگی
کی گواہی دیتا ہے وہیں ان کے عہد کی ایک اہم تہذیبی
قدر یعنی بین قومی اتحاد و اخوت پر دلالت کرتا ہے
یہی وہ تہذیبی ورثہ ہے۔ جو جدید ہندوستان کے تعمیرِ نو
میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

غالب کی ابتدائی تعلیم

وہ خشتِ اوّل ہے جس پر ان کی آئندہ فتوحاتِ
علمی و شعری کی بلند و بالا عمارت تعمیر ہونے والی
تھی لیکن اس باب میں بھی سوانح نگاروں نے
اکثر و بیشتر قیاس ہی پر تکیہ کیا ہے "غالب نامہ"
کے مصنف شیخ محمد اکرام کی تحقیق کا انحصار بھی

۵؎۔ مرزا غالب اردوئے معلی۔ صفحہ ۳۴۵

قیاس ہی پر ہے لکھتے ہیں۔

"مرزا کی والدہ خود پڑھنا لکھنا جانتی تھیں
اور قرین قیاس ہے کہ انہوں نے مرزا کی
تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا"۔[۱]

غالب کی ابتدائی تعلیم کے باب میں صرف دو استادوں کے نام لبطور تبرک کے ملتے ہیں۔ ایک آگرے کے مولوی محمد معظم اور دوسرے پارسی نژاد ملا عبدالصمد جس کی دو سالہ رفاقت غالب کو حاصل رہی۔ معاصرانہ تذکروں اور خود مکتوبات غالب سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ علوم متعارفہ و متداولہ کی درسیاتی تعلیم کے مواقع انھیں کم ہی میسر آئے اس کے باوجود غالب کی علمی و ادبی استعداد کا پایہ بہت بلند تھا جس میں ان کی غیر معمولی ذہانت قوتِ حافظہ اور فطری ذوق مطالعہ کو دخل رہا ہے۔

غالب نے اپنی مختلف تحریروں میں علمیت کا اظہار حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے نہ تو روایتی انداز کی انکساری برتی ہے اور نہ کہیں دعوائے

---

[۱] شیخ محمد اکرام "غالب نامہ" صفحہ ۲۵

ہمہ دانی کیا ہے البتہ وہ اپنی فارسی دانی کے مدعی ضرور رہے ہیں۔ ذیل کا اقتباس اس حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔

"میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں۔ مول نہیں لیتا۔ عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلبگار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدا فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"[1]

عربی کے عالم نہ ہوتے ہوئے بھی غالب نے نظم و نثر اردو و فارسی میں عربی الفاظ کو ایک اچھے فاضل اور ادیب کی طرح استعمال کیا ہے جس کے دیکھنے سے بقول حالی۔

---

[1] نثار احمد فاروقی۔ مضمون مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ رسالہ نقوش۔ آپ بیتی نمبر ص ۸۵ مرتبہ طفیل احمد

"کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں
گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فن
ادب سے ناواقف ہوگا[1]"

یہی حال علم عروض میں ان کی دستگاہ کا ہے۔ فارسی اور اُردو میں متعدد غزلیں اور ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحر میں انہوں نے لکھا ہے کہ با کمال اساتذہ بھی بغیر واقفیت عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے[2]

فلسفہ منطق، نجوم اور فن طب تو اس دور کے متداولہ علوم تھے اور علمیت کی دلیل مانے جاتے تھے۔ چنانچہ ان علوم سے غالب کی آگہی یقینی امر ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ فلسفیانہ مضامین کے باندھنے میں غالب نے ان علوم کی اصطلاحات سے خوب مدد لی ہے۔

غالب اگرچہ خالص صوفی شاعر نہیں تھے مگر صوفی منش ضرور تھے۔ ان کے اردو اور فارسی

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ صفحہ (۵۸)

[2] مولانا الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ صفحہ (۵۹)

کلام میں تصوف کے الہامی تصورات کی موجودگی اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کی طبیعت مسائل تصوف سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ متصوفانہ نکات ان کے اشعار کو رمزیت بخشتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کا تنوع انھیں صوفی شاعر تسلیم کروانے میں عناں گیر رہا ہے جس کا خود غالب کو بھی احساس تھا۔ دربار مغلیہ سے وابستگی کے بعد ایک موقع پر بہادر شاہ ظفر کے سامنے جب انہوں نے وہ مشہور غزل پڑھی جس کا مقطع تھا۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو ظفر نے برجستہ کہا تھا۔

"بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" [۱]

صوفیوں کی طرح تسلیم و رضا اور صبر و توکل کی خو ان میں بھی تھی۔ چنانچہ اپنے شاگرد رشید میر مہدی مجروح کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میری جان تو کیا کہہ رہا ہے۔ بہتیے سے

---

[۱] "مرزا نے شوخی سے کہا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"
مولانا حالی۔ یادگار غالب۔ ص۔ ۱۴۰

بیانا سو دیوانہ ۔ صبر و تسلیم، توکل و رضا شیوہ
صوفیا کا ہے مجھ سے زیادہ اس کو کون
سمجھے گا جو تم مجھے سمجھاتے ہو" [1]
انیسویں صدی یعنی غالب کے عہد تک خوش نویسی
اور خطاطی کو اشرف الفنون سمجھا جاتا تھا ۔ اس فن
کی تحصیل بادشاہوں کے لئے بھی باعث فخر ہوتی تھی
دیگر شرفائے دلّی کی طرح غالب کو بھی اس فن سے
لگاؤ تھا ۔ حالی کے بیان کے مطابق ۔۔

"مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت
شیریں اور دلآویز تھا ۔ جیسا کہ اہل ایران
کا ہوتا ہے ۔ باوجود خوشخطی کے نہایت
زود نویس اور تیز دست تھے" [2]

ان تمام مروجہ علوم کے مقابلے میں جو خصوصیت
غالب کو اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور منفرد مقام
عطا کرتی ہے وہ فارسی زبان و ادب سے ان کا والہانہ
شغف ہے ۔ اس امر پر تو تمام تذکرہ نگار متفق ہیں

---

[1] مرزا غالب اردوئے معلّی ۔ ص (۱۶۸)
[2] مولانا حالی ۔ یادگار غالب ۔ ص (۵۹)

ہیں کہ مرزا کی فارسی دانی مسلمہ تھی۔ فارسی زبان وادب سے فطری مناسبت اور غیر معمولی استعداد کے مد نظر غالب خود کو ہمیشہ تلمیذ الرحمان کہا کرتے تھے اور یہ بھی کہ "مجھے جو کچھ ملا ہے وہ مبداء فیاض کی عطا ہے"[1]

فارسی کے مسلم الثبوت استاد و شاعر ہونے کے دعوے پر وہ آخری سانس تک مصر رہے اس عہد میں فارسی زبان کی برتری اِس بات کی مقتضی تھی کہ علمی فضیلتوں کا مدعی فارسی زبان میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت بہم پہنچائے۔

غالب کے دو تہائی خطوط فارسی ہی میں ہیں اور ان میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں غالب نے فارسی زبان کے رموز و نکات سے بحث کی ہے۔ آج اگرچہ انھیں اُردو کے منتخب کلام کی بدولت شہرت دوام ملی ہے لیکن غالب کو ناز ہمیشہ فارسی کلام پر رہا جس کو وہ نقش ہائے رنگ رنگ کہتے تھے۔ فارسی نظم کی طرح غالب فارسی نثر پر بھی ماہرانہ عبور رکھتے تھے اور اپنے خاص اسلوب کی بناء پر انشاء پرداز مانے جاتے تھے۔

---

[1] محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ماخوذ ص (۵۰۵)

غالب کی ایک اور خصوصیت جس میں ان کا کوئی ہمعصر شریک نہیں، یہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف اردو کے مقابلے میں فارسی کو بلکہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے مقابلے میں ایران کے اساتذہ کو ترجیح دی ہے۔ ہندی نژاد فارسی دانوں میں وہ بجز حضرت امیر خسرو کے کسی کے قائل نہیں تھے [۱] حتیٰ کہ عہد اکبری کے فارسی شاعر فیضی کے بارے میں بھی ان کا یہ خیال تھا کہ ــــ

"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" [۲]

غالب نے شعر گوئی کا آغاز کیا تو اُردو غزل کا رنگِ عاشقانہ ہی مقبول تھا لیکن فارسی کی محبت میں اٹھارویں صدی کے مشہور فارسی گو شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کی تقلید کو اپنایا یہ تقلید صرف طرز و اسلوب تک ہی محدود نہیں بلکہ افکار اور خیالات میں بھی غالب بے دل کے مقلد رہے [۳]

---

[۱] مولانا حالی۔ یادگار غالب۔ص ۲۱

[۲] مولانا حالی۔ یادگار غالب ص ۲۱

[۳] طرز بیدل میں ریختہ کہنا ــــ اسد اللہ خاں قیامت ہے

اور فارسی کا یہ اثر ان کی اُردو غزلوں میں سرایت کر گیا۔ یہ مخصوص روش جو انہوں نے آگرے کے قیام کے دوران ہی اپنائی تھی دلّی میں اِس عہد کے ریختہ گو شعرا کے عام مذاق سے بالکل جداگانہ تھی اس لئے قبولیت سے محروم رہی۔ غالب کے اسی دور کے کلام کو دیکھ کر اٹھارویں صدی کے میر سخن نے دو ٹوک رائے دی تھی کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا" [1] تاریخ شاہد ہے کہ میر تقی میر کی یہ تنقید کس طرح غالب کی آئندہ فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ غالب بے دل کے مقلد سہی لیکن معتقد وہ میر کے تھے۔ اپنے بعض اشعار میں انہوں نے میر کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

شیخ ابراہیم ذوق پر "سودائی" کی پھبتی میں بھی میر کی معتقدی کا پہلو مخفی ہے [2]

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی یادگار غالب ماخوذ صفحہ (۱۰۹)

[2] ایک موقع پر غالب نے ذوق سے کہا تھا ۔ میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ "سودائی" ہیں ۔ خواجہ الطاف حسین حالی یادگار غالب ماخوذ ص (۶۷)

آگرے کی سکونت کے آخری چند سال یعنی ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۴ء تک کی مدت غالب کی زندگی کا وہ اہم زمانہ ہے جب ان کا سن اور فن دونوں بلوغت کی منزلیں طے کر رہے تھے کہ عین ایسے عالم میں انھیں متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔ ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے ۱۸۱۰ء میں ہوئی جب کہ غالب کی عمر تیرہ سال اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال تھی۔[1]

شادی کے کچھ عرصہ بعد غالب آگرہ کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر دلّی چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے یہ واقعہ غالب کی زندگی کا اہم موڑ ہے۔ آگرے سے دلّی آنے کے اسباب و علل کی تحقیق آج بھی محققانِ غالب کا ایک مستقل موضوع بنی ہوئی ہے ترک وطن اور ہجرت

---

[1] نواب الٰہی بخش معروف، نواب احمد بخش خاں والی ریاست لوہارو کے بڑے بھائی تھے۔ نواب احمد بخش خاں کا انگریز حکام پر بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ان ہی کی بہن غالب کے چچا نصر اللہ بیگ سے بیاہی گئی تھیں۔ اس طرح خاندان لوہارو سے غالب دوہری نسبت رکھتے تھے۔

بحوالہ ۔ حالی یادگار غالب ۔ ماخوذ ص ۔ ۱۶

خواہ تلاش معاش کی غرض سے ہو یا فروغ فن کے لئے دونوں صورتوں میں اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس لئے کہ حیات غالب کی تگ و تاز کا آغاز دلّی میں ان کے ورود سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت دلی میں اکبر شاہ ثانی کی بادشاہت اور بہادر شاہ ظفر کی ولیعہدی کا زمانہ تھا۔ مغل حکمراں تو ایک عرصہ ہوا کاروبار سلطنت سے بے تعلق کردئے گئے تھے۔ جہاں بانی اور جہاں داری کے ولولے خانہ جنگیوں کے ہاتھوں سرد پڑ چکے تھے۔ ان کی تگا پوئے دما دم کی جولانگاہ اب دکن کی بالاحصار کی بجائے صرف لال قلعہ کی فصیل رہ گئی تھی۔ فرنگی شاطروں نے محض فریب نظر کی خاطر مغل بادشاہوں کی رسم تخت نشینی اور ولیعہدی کو برقرار رکھا تھا۔ ہاں مگر علوم و فنون کی گرم بازاری تھی۔ شہر دلّی اب بھی تجارتی، صنعتی اور ثقافتی اعتبار سے ایشیائی ممالک کا مرکز تھا۔ ہندوستان کی مصنوعات کا چاردانگِ عالم میں شہرہ تھا جو فرنگیوں کے دل میں کھٹکتا تھا۔ چنانچہ وہ تاک میں تھے کہ کب ان کا نام و نمود مٹ جائے اور کب ہندوستان کو اپنی مشینی مصنوعات کی منڈی بنائیں۔ مغل حکمران اور دانشورانِ دلّی فرنگی شاطروں کی ان سیاسی چالوں سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن ملک کی داخلی

شورشوں اور سازشوں کے ہاتھوں بے بس تھے۔ ایسے میں دلی والوں کے واماندگئ شوق نے علم و ادب کی پناہ گاہیں ڈھونڈھ لی تھیں۔ دلی کے مکتبوں اور مدرسوں کی رونق روز افزوں تھی۔ خانوادہ ولی اللہ کے سرچشمۂ علوم سے فیضان جاری تھا۔ شعر و ادب کی محفلیں تو اس وقت جیسے نصف النہار پر تھیں۔ دلّی میں اُن دنوں شاہ نصیر کا طوطی بولتا تھا۔ جن کی دکن میں بھی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی اور اِدھر دلی میں ان کے شاگرد شیخ ابراہیم ذوق کے اقبال کا ستارہ بلندی پر تھا جو ولیعہد سلطنت بہادر شاہ ظفر کے دربار سے منسلک تھے اور اکبر شاہ ثانی کے قصیدہ خواں بھی تھے۔ اسی قصیدہ خوانی کے طفیل بادشاہ کی طرف سے خاقانیٔ ہند کا خطاب پا چکے تھے اور ملک الشعراء کے عہدے پر فائز تھے۔ قلعہ کے شہزادے اور سلاطین زادے ان کے حلقہ بگوش تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں قلعہ کی ٹکسالی زبان کا سکہ، سکہ رائج الوقت تھا۔ ذوق اور ظفر اسی زبان کے عاشق تھے۔ شاہی ایوانوں میں ذوق کے قصیدوں کی دھوم تھی لیکن شعری دنیا پر غزل کی حکمرانی تھی۔ ایوانِ غزل کے مسند نشینوں میں ذوق اور ظفر کے علاوہ صہبائی، آزردہ، شیفتہ، مومن اور ممنون جیسے

شعرا شامل تھے غالب جیسے ذہین، تیز نظر اور زود فہم انسان کے مشاہدے سے دلی کی یہ تاریخی اور سماجی اتھل پتھل پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اب سپاہیانہ جوہروں کی آزمایش کا وقت لد گیا اور اب انھیں اپنے آبا کے تیر کا کام نوک قلم سے لینا ہے۔ ع

شد تیر شکستہ نیاگاں قلمم[۱]

ایسے حالات میں غالب کو اپنا رنگ جمانا تھا یعنی طرز بیدل میں ریختہ گوئی کا جادو جگانا تھا۔

---

[۱] "ایک قطعہ میں کہتے ہیں کہ میں افراسیاب کی نسل سے ہوں۔ اسلاف میرے تلواریں اور تیر چلانے والے تھے اب ان کا تیر ٹوٹ کر میرا قلم بن گیا ہے۔"

محمد اکرام غالب نامہ۔ ماخوذ ص (۳۶۱)

۳

آگرے سے دلّی تک ——————————

"دیکھئے کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"

دلّی غالب کے لئے نیا شہر نہیں تھا۔ سات سال کی عمر سے ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔[1] اس مرتبہ غالب ایک اور حیثیت سے دلّی آئے تھے۔ ان کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف خود صاحب دیوان شاعر تھے۔ شاہ نصیر اور ذوق سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ خود ان کے گھر بھی شعری محفلیں منعقد

---

[1] اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ۔ مکتوب بنام مرزا علاؤالدین احمد خاں۔ صفحہ ۱۴۴

ہوتی تھیں۔ یہ اپنے بھائی نواب احمد بخش خاں کے بر خلاف متقی اور نیک نفس تھے[1] رشد و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خود استاد ذوق ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ کچھ تو ان کے زہد و تقویٰ کے سبب اور کچھ نواب احمد بخش کے اثر و رسوخ کے سبب عمائدین شہر میں ان کی ان کے اہلِ خاندان کی بڑی توقیر تھی۔ ان ہی کے توسط سے غالب کو دلّی کے شرفا سے متعارف ہونے میں دیر نہ لگی ۔ خود غالب کی متاثر کن شخصیت، فطری ذہانت اور خداداد شعری صلاحیتوں کے سبب چند ہی سال میں غالب کے دوست احباب کا ایک وسیع حلقہ بن گیا۔ جن میں بعض اصحاب علم و فن منتخب روزگار تھے۔ مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ۔ یہاں ایک امر قابل ذکر ہے کہ جس سرعت کے ساتھ غالب کی شخصیت نے دلّی کی معتبر سوسائٹی کو مسخر کر لیا اسی سرعت کے ساتھ ان کے رنگ شاعری کو قبولیت نہیں مل سکی۔

---

[1] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ۔ ص ۲۸ ۔ ۲۹

غالب اب نہ صرف دلّی کے مخصوص مشاعروں میں شریک ہو رہے تھے بلکہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بھی انھیں قسمت آزمائی کا موقع ملا۔ اِن مشاعروں میں ان کے کلام پر کبھی دبے دبے الفاظ میں اور کبھی علی الاعلان چوٹیں ہونے لگیں۔ پھبتیاں کسی جانے لگیں اور دلّی والوں کا یہ برتاؤ غالب کے حق میں ایک چیلنج بن گیا[۱]

غالب کی غزل گوئی اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئی آواز تھی۔ ایک تو غالب کا فارسی آمیز کلام، دوسرے عبد القادر بیدل کے اتباع میں ان کی دقت پسندی، تیسرے غالب کا نظریہ شعر کہ شاعری قافیہ پیمائی کا نہیں معنی آفرینی کا نام ہے[۲] ان خصوصیات کی بناء پر غالب کا کلام غیر معمولی ذہانت اور نکتہ سنجی کا متقاضی تھا جب کہ لوگوں کا مذاق سیدھے سادے اور سطحی قسم کے عاشقانہ کلام کا عادی ہو چکا تھا۔ تصوفانہ اشعار بطور تبرک کے کہے

---

[۱] محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ماخوذ ص۔ ۵۱۲

دیڑھ جز پہ بھی تو ہے مطلع ومقطع غائب
غالب آساں نہیں صاحب دیوان ہونا

[۲] مولانا حالی۔ یادگار غالب۔ ماخوذ ص (۱۳۹)

جاتے تھے۔ صوفی شعراء میں خواجہ میر دردؔ کی جگہ کوئی نہیں لے سکا تھا۔ ظفر کا صوفیانہ کلام بہت بعد کی چیز ہے۔ غالب کے سامنے دو راستے تھے یا تو زمانہ کا مذاق بدلے یا پھر اپنی طرز فکر و روش بدلئے جب کہ غالب کی فطرت کا تقاضہ یہ تھا کہ ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

لیکن لطف کی بات یہ کہ رفتہ رفتہ یہ دونوں کام انجام پا گئے یعنی غالب نے کچھ اپنی وضع بدلی اور زمانے نے کچھ اپنی "خو" چھوڑی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے مشوروں نے اثر دکھایا[۱] غالب بھی سلیم الطبع تھے۔ ذوق شعر گوئی جس قدر بلند پایہ تھا اس سے کہیں زیادہ دقیع ان کا تنقیدی شعور بھی تھا۔ غالب نے اپنے کلام اور طرز کلام کا تنقیدی جائزہ لیا اور کسی حد تک اپنے عہد کے مذاق پر بھی اثر انداز ہونے میں کامیابی حاصل کی شیفتہ اور مومن جیسے باکمال بھی غالب کے مداح اور ان کے فن سے متاثر تھے۔ آگے چل کر ظفر بھی ان کے حلقۂ اثر سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ غالب کی شخصیت کا یہی

---

[۱] مولانا حالی۔ یادگار غالب۔ ماخوذ۔ ص (۱۱۳)

اہم رنگ ہے جس کے نتیجہ میں اُردو ادب کے شعری سرمایہ میں غالب کا یہ منتخب دیوان داخل ہو سکا جو آج نہ صرف مخزِ ہندوستان بلکہ فخرِ عالم ہے[۱] اُردو کے منتخب دیوان کے ضمن میں غالب کے ایک مکتوب سے بھی شہادت ملتی ہے۔

"ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مطلع تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اور اوراق چاک کر دیئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان میں رہنے دیئے"[۲]۔

---

[۱] ۱۸۴۱ء میں یہ منتخب دیوان سر سید احمد خاں اور ان کے بھائی سید محمد خاں کے ذاتی پریس سید المطابع سے شائع ہوا۔ فارسی دیوان کی اشاعت اس کے کوئی چار سال بعد عمل میں آئی۔ شیخ محمد اکرم۔ غالب نامہ۔ صفحہ (۸۸)

[۲] نثار احمد فاروقی مضمون "مرزا اسد اللہ خاں غالب" رسالہ نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ (۴۹۳)

ابھی غالب دلی کے دربار میں قدم جمانے بھی نہیں پائے تھے کہ ولیعہد ظفر سے اختلاف کی ایک درباری پیچ میں الجھ گئے۔ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء — ۱۸۳۷ء) ظفر کی بجائے شہزادہ سلیم کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے۔ ولیعہدی کے اس مسئلے پر انگریز ریذیڈنٹ کو بادشاہ سے اختلاف تھا اِس درباری مسئلہ پر غالب نے اکبر شاہ ثانی کا ساتھ دیتے ہوئے شہزادہ سلیم کی مدح میں ایک ایسا شعر کہہ دیا جس میں ولیعہد ظفر کی ذم کا پہلو نکلتا تھا ؎

زہے مناسبت طبع شاہزادۂ سلیم
بہ فیض تربیت بادشاہ ہفت اقلیم[۱]

اس شعر نے ایسا غضب ڈھایا کہ آنے والے دور میں غالب کی ترقیوں کے حق میں ایک عرصہ تک رکاوٹ بنا رہا۔ ظفر کے دل میں غالب کی طرف سے رنجش کی گرہ پڑ گئی اور ایسی پڑی کہ غالب کی گرہ والی ردیف کے قصیدے سے بھی نہ کھل سکی[۲] ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر

---

[۱] ڈاکٹر یوسف حسین خاں — غالب اور آہنگ غالب — صفحہ (۴۱)
[۲] ڈاکٹر یوسف حسین خاں — غالب اور آہنگ غالب — صفحہ (۴۱ — ۴۲)

کی تخت نشینی کے بعد ذوق استاد شاہ اور حسبِ دستور ملک الشعرائی کے منصب پر فائز رہے اور غالب کو آنے والے دس سال تک دربار میں رسائی کا موقع نہیں مل سکا۔ یہ زمانہ غالب کے حق میں بڑی آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ درباری تمدن سے واقفکار ہی غالب کے اس کرب کو سمجھ سکتے ہیں کہ ایک فن کار مرکزِ سلطنت میں رہے اور درباری اعزاز و منصب سے محروم رہے جس کو غالب اپنے کمالِ فن کی بناء پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کے اندر کا تزک زادہ انھیں کبھی اس حق سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ کر سکا مگر اپنی سپاہیانہ فطرت کے سبب وہ بڑے ضبط و تحمل سے بھی کام لیتے رہے۔ یہ ضبط و تحمل ان کے کلام میں میں بھی موجود ہے۔[1] اگر یہ نہ ہوتا تو ذوق اور ظفر دونوں غالب کے طنز و مضحکات کا نشانہ بنتے اس طرح زمانہ کو ایک اور سودا تو مل جاتا پر غالب نہ ملتا۔ لیکن غالب کی شخصیت کا یہ اہم پہلو ہے کہ انہوں نے عالی حوصلگی کے ساتھ یہ کہہ کر اپنے آپ کو

---

[1] غلام رسول مہر۔ مضمون غالب کی خاندانی پنشن "ماخوذ۔ ص ۱۳۵ بحوالہ "احوال غالب" مرتب۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد۔

سنبھالا ہے ؎

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہئے

دلّی میں غالب کو بہ یک وقت دو محاذوں پر توانائی صرف کرنی پڑی۔ ایک علمی و ادبی دوسرے مالی۔ جن سے وہ زندگی کی آخری سانس تک نبرد آزما رہے۔ ع
"غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا"
والا معاملہ تھا۔ ان کی آبائی جاگیریں تو ان سے کبھی کی چھن چکی تھیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ درباری سرپرستی سے محروم تھے۔ گزر بسر کا انحصار صرف اس وظیفہ پر تھا جو نواب احمد بخش کی کرم فرمائی کے طفیل، تقسیم در تقسیم کے بعد سالانہ پندرہ سو روپے پر مشتمل تھا جو غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف میں بٹ کر ساڑھے سات سو روپے سالانہ رہ جاتا تھا۔[1] اہل و عیال کی گزر بسر ملازمین و متوسلین کی پرورش، دلی کے امرا و شرفا کا ساتھ اور غالب کی وضعداریاں اس مختصر سی پونجی کے بل پر کس طرح

---

[1] غلام رسول مہر۔ مضمون "غالب کی خاندانی پنشن" بحوالہ احوالِ غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ماخوذ ص (۱۳۵)

نبھائی جا سکتی تھیں۔ خیال آیا کہ آبائی وظیفے کی رقم جو استحقاق سے کم مل رہی ہے اس کے بڑھانے کی صورت نکالی جائے۔ یہی خیال غالب کے سفر کلکتہ اور مقدمہ بازی کا محرک بنا۔ یہ غالب کی زندگی کا پہلا طویل سفر ہے جو کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔

کلکتہ کے سفر کا آغاز ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ اسی سال غالب کے خسر اور ان کے مربی مرزا الٰہی بخش معروف نے وفات پائی۔ اسی زمانے میں غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ غالب اس دوران اپنے شیر خوار بچوں کی موت کے صدمے بھی اٹھا چکے تھے۔[۱] نواب احمد بخش خاں کی ریشہ دوانیوں کے سبب بھی غالب بہت تنگ دل تھے۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق انھیں مقدمہ بازی کی مصیبت اپنے سر لینی پڑی۔ کلکتہ جیسے دور دراز شہر کا سفر، وسائل محدود، زاد راہ مفقود، مقدمہ جیت جانے کی امید میں ہزاروں کے مقروض بھی ہو گئے۔ کوئی انیس مہینے بعد غالب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ اس سفر کے دوران انھیں لکھنؤ اور بنارس میں ٹھہرنے

---

[۱] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ ص (۶۱، ۶۲)

تاریخی شہروں میں کچھ عرصہ قیام کا موقع ملا۔ شیخ محمد اکرام کی تحقیق کے مطابق غالب لکھنو میں تقریباً گیارہ مہینے ٹھہرے[1] وہاں کے اہلِ دربار اور اہلِ فن سے بھی ربط پیدا کیا۔ بہت ممکن ہے کہ انھیں دربار اودھ سے نیک توقعات بھی رہی ہوں۔ نوابانِ اودھ کی سرپرستی میں لکھنو کی علمی وادبی ترقیوں کے غالب معترف تھے۔ یہ کہنا مبنی برحقیقت نہیں معلوم ہوتا کہ —

"یہاں کی انحطاط پذیر تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں کا ان کے ذہن نے غالباً کوئی اثر قبول نہیں کیا — چنانچہ بعد کے کلام میں کلکتہ و بنارس کی طرح لکھنو کا

---

[1] "مرزا دہلی سے کب روانہ ہوئے اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن دہلی سے وہ لکھنو گئے اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۷/جون ۱۸۲۷ء یا ۲۶/ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ ہے۔ لکھنو میں غالب نے ایک عرصہ تک قیام کیا اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جو انہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی صحیح سمجھا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ کم ازکم دو محرم سے ۲۶/ذی قعدہ تک یعنی تقریباً گیارہ مہینے وہ لکھنو مقیم رہے"۔ شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ صفحہ (۶۳)

تذکرہ نہیں ملتا"[1]

اس کا امکان ہے کہ انتزاع سلطنت کے بعد غالب نے مصلحتاً لکھنؤ کے تذکرے سے احتراز کیا ہو ورنہ لکھنؤ کے تعلق سے غالب کے جو تاثرات تھے اس کا اندازہ میاں داد خاں سیاح کے نام ایک مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"برخوردار تمہارا خط پہونچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے"[2]

یہ اور بات ہے کہ اس امیر گر سرکار سے غالب فیض یاب نہیں ہو سکے۔ ایک تو یہ کہ وقت کی تنگی کے سبب ان سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے قصیدہ انجام نہیں پا سکا دوسرے

---

[1] ظ۔ انصاری۔ غالب شناسی صفحہ (۵۶)

[2] مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ صفحہ (۲۱)

ان کی فطری خود پسندی اور انانیت بھی مانع آئی[۱] وزیر سلطنت کو خوش نہیں کرسکے۔ نذر نذرانے کی پیش کش سے معذرت چاہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ الٹے وزیر سلطنت سے اپنی تعظیم کے خواستگار ہوئے[۲] غالب اِن دنوں بقول خود "نو آموز شیوۂ گدائی" تھے۔ ایک فارسی مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے غالب کے احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"آنچہ در باب ملازمت خلافِ آئینِ
خویشتن داری و ننگِ شیوۂ خاکساری
بود"۔ [۳]

---

[۱] "معتمد الدولہ آغا میر نے اپنی ملازمت کا آغاز بطور ایک خانساماں کے کیا تھا لیکن نواب بیگم اور رزیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ غالب نے اسی سبب سے ان کی تعظیم کو اپنے لئے باعث عار سمجھا ہوگا" شیخ محمد اکرام غالب نامہ صفحہ ۶۵

[۱] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ ماخوذ صفحہ (۶۴)

[۲] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ ماخوذ صفحہ (۶۵)

البتہ غالب کلکتہ سے جب دلّی لوٹے تو انہوں نے قصیدہ لکھ کر بادشاہ اودھ کی خدمت میں بھجوایا۔ قصیدے کے لکھنو پہنچنے تک وہاں کی سرکار بدل گئی۔ غالب نے قصیدے میں ممدوح کا نام بدل کر واجد علی شاہ والئی سلطنت کی خدمت میں بھجوایا جس کے صلہ میں پانچ ہزار زر نقد دربار اودھ سے غالب کو دینا طے پایا تھا لیکن نائب سلطنت کی بد دیانتی کے سبب یہ رقم غالب تک نہیں پہنچ سکی۔ جس کی اطلاع لکھنو کے استاد باکمال شیخ ناسخ نے غالب کو دی تھی [1] قبل اس کے غالب اس معاملہ کی چھان بین کرواتے، انتزاع سلطنت کا سانحہ پیش آیا۔ واجد علی شاہ لکھنو سے جلا وطن کئے گئے اور انھیں بطور اسیر سلطانی لکھنو سے میٹیا برج کلکتہ منتقل ہوتا پڑا [2] لکھنو کی تاریخ کا ایک درخشاں باب قصہ پارینہ بن گیا اور غالب ایک قدردان دربار کی سرپرستی سے محروم رہے۔

---

[1] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ صفحہ (۱۱۰ - ۱۱۱)

[2] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ صفحہ (۶۵)

لکھنو کے مختصر سے قیام میں مرزا غالب کو ناسخ کی طرز شاعری، زبان کی صفائی اور اصطلاحات کے مطالعہ کا یقیناً موقع ملا ہوگا۔ بقول شیخ محمد اکرام۔

"یقین ہے کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت
نے ان تمام باتوں سے فائدہ اٹھایا
ہوگا[1]"

لکھنو سے غالب کی روانگی کی تاریخ ۲۷/ جون ۱۸۲۷ء بتلائی جاتی ہے[2] الہ آباد کے راستے سے وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں بنارس کی سیر کے لئے انھیں چند روز توقف کرنا پڑا۔ بنارس کے چند روزہ قیام نے ان کے قلب کو کشادگی بخشی۔ دوستوں کے نام اپنے مکتوبات میں بھی بنارس کی رعنائی اور دلکشی کا خوب ذکر کیا ہے۔ مثنوی "چراغِ دیر" اس سفر کی یادگار نظم ہے جو غالب کی قوتِ مشاہدہ، جوشِ فکر، وسیع المشربی اور روا دارانہ ذہن کی آئینہ دار ہے۔ بقول نبی ہادی۔

---

[1] شیخ اکرام۔ غالب نامہ صفحہ ٦٦
[2] شیخ اکرام۔ غالب نامہ صفحہ ٦٦

"اس مثنوی میں مغلوں کی روادارانہ
طرز حکومت کی روح
کارفرما ہے" [۱]

غالب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے جہاں ان کا قیام دو سال کے قریب رہا۔ کلکتہ میں انھیں خلاف توقع دو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقدمہ کی ناکامی جو غالب کی زندگی کا تلخ تجربہ ثابت ہوئی دوسرے طرفداران قتیل کی غالب سے چشمک۔ وظیفہ کے مقدمہ میں غالب اگرچہ اپنے دعویٰ میں حق بجانب تھے۔ لیکن نواب احمد بخش خاں کی کارستانیوں کے سبب غالب اس کو صحیح ثابت نہیں کر سکے [۲] غالب ابھی کلکتہ پہنچنے بھی نہیں پائے

---

[۱] نبی ہادی۔ مغلوں کے ملک الشعراء صفحہ ۲۹۹

[۲] غلام رسول مہر کے تحقیقی مضمون "غالب کی خاندانی پنشن" سے یہ ثبوت ملتا ہے۔ "نصر اللہ بیگ کے انتقال کے ساتھ ہی سونکھ، سونسا کی جاگیر انگریزوں نے سنبھال لی۔ ۴/ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کے پچیس ہزار روپے اس شرط پر معاف کر دے کہ وہ دس ہزار روپے (باقی صفحہ ۵۶ پر)

تھے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا اور مقدمہ کی رہی سہی کسر ان کے جانشین نواب شمس الدین احمد خاں رئیس فیروز پور جھرکہ نے نکال دی ۔ نواب شمس الدین اپنے باپ کی طرح بڑے حکام رس تھے ۔ ان کے اثر و رسوخ کے آگے غالب کی ایک نہ چلی ۔ اِدھر غالب انگریز حکام

(بسلسلہ صفحہ ۵۵ سے) سالانہ نصر اللہ بیگ کے پسماندوں کو دیں مرحوم کے رسالے کے پچاس سواروں کو جن کا افسر خواجہ حاجی تھا اپنے انتظام میں لیں اور قیام امن کے لئے حکومت سے کوئی امداد نہ مانگیں۔ یہ سرکاری دستاویز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ میں بھی موجود تھی غالب نے اپنے مقدمے کے لئے اسی کو بنیاد بنایا تھا ۔ ایک مہینہ تین دن بعد یعنی ۷/ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور حکم اس مضمون کا حاصل کر لیا کہ نصر اللہ بیگ کے پسماندوں کو پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جائیں اور ان میں خواجہ حاجی بھی شامل ہوگا ۔ اس کی کوئی نقل سرکاری دفتر کو نہیں بھیجی گئی اور نہ غالب کو اس کا علم تھا ۔ اصولاً یہ وثیقہ غیر مستند اور سرکاری طور پر ناقابل قبول تھا لیکن غالب کے مقدمے کو اس وثیقہ کی بنا پر خارج کر دیا گیا ۔ مقدمے میں واقعات اور حقائق کے تجزیہ کے مقابلہ میں نواب احمد بخش خاں اور لارڈ لیک کے شخصی مراسم کو ملحوظ رکھا گیا جسکو مزید تقویت نواب شمس الدین احمد خاں کے انگریز حکام سے تعلقات اور ان کے قیمتی تحفہ و تحائف سے ملی ۔ "احوال غالب" ماخوذ صفحہ ۱۳۵

کی عدل پسندی اور کارکردنظم و نسق کی مداحی میں قصیدے
کہہ کر بھیجتے رہے ادھر نواب شمس الدین کے بہی خواہوں
نے مقدمہ خارج کروا دیا۔ ایک غریب الدیار
خستہ حال انسان کے لیئے یہ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن
آفریں ہے غالب کی ہمت پر کہ انہوں نے ہار نہیں
مانی بلکہ ولایت میں اپیل کی ٹھانی۔ ملکہ وکٹوریہ انگلستان
کے نام ایک مدحیہ قصیدہ بھجوایا جس کے جواب
میں آئی ہوئی رسید غالب کو غدر کے آڑے وقت میں
کام آئی۔ چند جزوی تقاضوں جیسے دربار میں کرسی نشینی
کا شرف، سات پارچہ کا خلعت معہ تین رقوم جواہر اور
خطاب خاں بہادر بسیار مہربان اور سرکاری خزانے سے
وظیفہ کی ادائی کی منظوری کے علاوہ مقدمے کے
فیصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

کلکتہ میں تقریباً دو سالہ قیام کے دوران غالب کو
یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع
ملا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد
کلکتہ میں عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے میدان
میں ترجموں کے ذریعہ ایک نئی چہل پہل آگئی تھی۔ اردو
جو ابتداء میں انگریز حکام کی ضرورت کی زبان تھی وہ آگے چل کر

ان کے شوق کا سامان بن گئی۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے ماہانہ مشاعروں میں جہاں ہزاروں کی نشست ہوتی تھی اور فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی کے بڑے بڑے باکمال بھی جمع ہوتے تھے، غالب بھی مدعو کیے گئے۔ بعض ادبی محفلوں میں غالب کی بدیہہ گوئی کا امتحان بھی لیا گیا۔ چکنی ڈلی والی نظم اسی بدیہہ گوئی کی یادگار ہے۔ ان ادبی مجلسوں میں غالب کی غزل ہرائی پر بعض گوشوں سے ان کی فارسی ترکیبوں پر گرفت ہوئی اور سند میں مرزا قتیل کا کلام پیش کیا گیا۔ اسی بات نے غالب کو چراغ پا کردیا۔ وہ صاحب کمال جو بجز حضرت امیر خسرو کے کسی اور ہندی نژاد فارسی داں کو خاطر میں نہ لائے وہ بھلا مرزا قتیل کی سند کو کیوں کر مان سکتا تھا۔ چنانچہ ہندی نژاد فارسی دانوں سے انحراف نے مجادلۂ کلکتہ کی صورت اختیار کرلی۔ اِدھر کچھ بزرگوں نے غالب کی طرفداری بھی کی مگر بقول ظ۔ انصاری۔

"اِدھر اہلِ نظر کی اقلیت تھی اور اِدھر نقار خانے کی اکثریت"۔

غالب مرزا قتیل کے طرفداروں سے الجھنے میں بھی اپنی سبکی محسوس کرتے تھے اس لئے انہوں نے ایک مثنوی

بہ عنوان " بادِ مخالف" جس کا پہلا نام آشتی نامہ تھا، شائستگی
کے ساتھ لکھ کر کلکتے والوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش
کی۔ یہ مثنوی ہجوِ ملیح سے کم نہ تھی۔ تعریف کے پردے
میں دبی چوٹیں کلام غالب میں طنز نگاری کی ایک
یادگار چیز بن گئی ؎۱ اس واقعہ نے غالب کا پیچھا نہیں
چھوڑا بلکہ کوئی تیس سال بعد پیش آنے والے قاطع برہان کے
قضیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس لئے کہ ان دنوں عبد الحلیم شرر
کی تحریر کے مطابق۔

"بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ بھی
قتیل کی عزت کرتے تھے اور ان کی فارسی
دانی کو مسلّم گردانتے تھے" ؎۲

؎۱ ظ۔ انصاری۔ غالب شناسی۔ ماخوذ صفحہ ۵۵

؎۲ لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں ملا فائق کا پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا
جو ایک نو مسلم فارسی داں تھے وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ
"بوے کباب مرا مسلماں کرد" مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم اس کے شوق
اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے انھیں مسلماں ہونے پر مجبور کیا۔ انہوں نے
محض اسی شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور طہران
و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادب فارسی کے اس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئے کہ خود
اہل زبان بھی ایسے باکمال زبان داں پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں مولوی عبد الحلیم شرر گذشتہ لکھنؤ (صفحہ ۱۲۹)

غالب کو مرزا قتیل کی شخصیت سے کوئی پرخاش نہیں تھی تعرض ان کی فارسی دانی سے تھا[1]۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحلیم شرر کا حقیقت پسندانہ تجزیہ قابل ذکر ہے۔

"مرزا غالب نے جا بجا مرزا قتیل پر حملے کئے ہیں بے شک مرزا غالب کا مذاق فارسی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہل زبان کے کسی کا کلام سند نہیں ہوسکتا مگر ان کے زمانے میں چونکہ اودھ سے بنگالے تک لوگ قتیل کے پیرو تھے اور بات بات پر قتیل کا نام لیا جاتا تھا اس لئے مرزا غالب کو اکثر طیش آگیا"[2]

---

[1] ذاتیات سے کوئی بحث نہیں تھی لیکن مخالفانہ حملوں سے زچ آکر غالب نے ایک آدھ جگہ ذاتیات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔

[2] عبدالحلیم شرر۔ گذشتہ لکھنؤ۔ صفحہ (۱۲۹)

قیام کلکتہ کے دوران ہی غالب مغرب کی تمدنی و تہذیبی قدروں سے متعارف ہوئے۔ ان اقدار کو ہندوستانیوں کے استقبال کی تفسیر گردانئے کا فلسفہ پہلی بار غالب ہی نے سمجھایا۔ "ساقی بزم آگہی" سے جو فرضی مکالمہ کہلوایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کلکتہ کے بدلتے ہوئے حالات اور تمدنی نظام نے ان کی بصارت اور بصیرت کی سیر چشمی کے لئے خوب سامان فراہم کئے۔ "چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا" والی بات انہوں نے غالباً اسی پس منظر میں کہی ہوگی ۱؎

غالب کی اس طرز فکر کے اثرات ان کی آئندہ زندگی میں بہت دور تک ملتے۔ یہی روشن خیالی تھی جو سر سید کی تصحیح آئین اکبری کی تقریظ میں مانع آئی اور سر سید کے پردے میں آنے والی نسلوں کو یہ شعور بخشا کہ ع۔

"مردہ پروردن مبارک کار نیست ۲؎"

۱؎ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ کلیات غالب فارسی۔ جلد اول۔

* ساقی بزم آگہی روزی" قطعہ نمبر (۱۰) ص (۱۲۴)

۲؎ غالباً یہی وہ طرز فکر ہے جو مستقبل کے فلسفی شاعر اقبال کے یہاں اس طور پر جلوہ فگن ملتی ہے ؎

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

غالب کی شخصیت کے اس پہلو سے متعلق ذیل کے اقتباس میں لطیف اشارے ملتے ہیں۔

"یہ سفر کے کم و بیش تین سال دہلی سے کلکتہ نہیں بلکہ ہندوستان کے ماضی و مستقبل کے سفر میں گزرے۔ یہ صدیوں کے درمیان کا قریبی مشاہدہ تھا۔ غالب کلکتے کی سیر کو نہیں گئے تھے بلکہ ایک درخواست دہندہ کی حیثیت سے انگریزی نظام حکومت اہلکاروں اور افسروں سے اپنی امارت کا حق منوانے گئے تھے۔ ایک شاعر کی نظر سے انہوں نے ہندوستان کا وہ مشرقی شہر دیکھا جہاں مشرق و مغرب کا تمدن گلے مل رہا تھا[1]۔

سفر کلکتہ کی ادبی یادگاروں میں مثنوی "چراغ دیر" اور مثنوی "باد مخالف" کے علاوہ وہ مجموعہ کلام بھی ہے جو کلکتہ ہی کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اشاعت پذیر

---

[1] ظ۔ انصاری۔ غالب شناسی۔ صفحہ (٦١)

ہوا۔ غالب نے اس کا نام گلِ رعنا رکھا تھا۔ یہ مجموعہ اسی ابتدائی دور کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب تھا جو طرز بیدل میں تھا اور اُن دنوں طرز بیدل میں ریختہ کہنا غالب کی نظر میں ایک قیامت کی ادا تھی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالب کے بعد پھر کسی اور ریختہ گو سے طرز بیدل کی تقلید ممکن نہ ہو سکی۔ گلِ رعنا کا مقدمہ اور خاتمہ غالب کے کلیات نثر فارسی میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں [1]

غالب اپنے وظیفے کے قضیے سے مکمل طور پر چھٹکارا ابھی نہیں پا سکے تھے کہ ۱۸۳۵ء میں دلی کے انگریز ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کا فتنہ برپا ہوا۔ تحقیق و تفتیش میں نواب شمس الدین احمد خاں اس سازش میں ملوث پائے گئے۔ اتفاق کی بات کہ اس سنگین مقدمہ میں مقتول غالب کا دوست تھا اور قاتل کی غالب دشمنی مسلمہ تھی [2]

---

[1] شیخ محمد اکرام کی تحقیق کے مطابق گل رعنا کا ایک نسخہ حسرت موہانی کے پاس تھا (الف) اور ایک قلمی نسخہ مالک رام کی ملکیت ہے جس کو انہوں نے ایڈٹ کر کے شائع کروایا۔ (ب)

(الف) شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ ماخوذ صفحہ (۷۳)

(ب) مالک رام۔ ذکر غالب۔ ماخوذ صفحہ (۲۰۳)

[2] قتل کا واقعہ جس قدر سنگین تھا انگریزوں کی طرف سے (باقی صفحہ ۶۴ پر۔)

غالب کو بھی حالات کی سنگینی کا پورا، پورا احساس تھا انہوں نے خود کو اس معاملہ سے الگ رکھنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ لیکن انگریز حکام سے غالب کے دوستانہ مراسم کے سبب دلی والوں کی نظر میں غالب کا موقف شبہہ سے بالاتر نہیں تھا۔ چنانچہ معاصر تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی دس سال تک دلی والوں نے خاص طور پر خاندان لوہارو کے ہمدردوں نے غالب کا سوشیل بائیکاٹ کیا ؎۵۔ بعض اصحاب کے خیال کے مطابق اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ غالب کو رسوا اور ذلیل کرنے کے لیئے قمار خانے کے جرم میں ملوث کر کے انھیں قید با مشقت کی سزا دلوائی گئی۔ یہ حادثہ

(باقی صفحہ ۶۳ سے) دی جانے والی سزا بھی اتنی ہی سنگین تھی پھانسی کی سزا اور پھر نواب احمد بخش خاں جیسے انگریز دوست، انگریز نواز ہندوستانی رئیس کے جانشین کے حق میں دلی والوں کے لئے ناقابل برداشت تھی، انگریزوں کو بھی اس سنگین اقدام کا پوری طرح احساس تھا جس کے لئے انہوں نے فوجی پہرے کی مدد سے سخت احتیاطی تدابیر اختیار کیں ورنہ ممکن تھا کہ اس وقت کوئی ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

؎۵ شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ صفحہ ۸۹

۱۸۴۷ء میں پیش آیا۔ حالی نے اپنی تصنیف یادگارِ غالب کی زندگی کے ایک سانحہ کو ایک اتفاقی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی[1]

---

[1] ابوالکلام آزاد نے نواب امیر الدین والیٔ لوہارو کے حوالے سے ایک مبسوط نوٹ میں یہ تحریر کیا ہے کہ غالب نے اپنے مکان کو جوے بازی کا اڈہ بنا رکھا تھا اور بہ حیثیت مہتمم قمار خانہ غالب کو ایک معقول رقم مل جاتی تھی جس سے وہ اپنے امیرانہ مصارف کی کفالت میں مدد لیتے تھے۔ (عتیق صدیقی۔ غالب اور ابوالکلام مطبوعہ ۱۹۶۹ء جمال پرنٹنگ پریس دہلی۔

روایت اور درایت کے اصل کو مدنظر رکھا جائے تو پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خاندان لوہارو کے ایک فرد کا بیان ان حالات میں آیا قابل قبول ہوسکتا ہے جبکہ نواب شمس الدین خاں کی سزائے موت کے تعلق سے وہ غالب کے رویہ سے بدگمان تھے اور آگرے کے اخبار کے اس بیان کی تردید کی تھی جس میں غالب کو خاندان لوہارو کا قرابت دار کہا گیا تھا جس کی تردید میں لوہارو والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ غالب سے ہمارا کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے بلکہ دور کا سببی تعلق ہے (شیخ محمد اکرام غالب نامہ صفحہ ۹۹) اس سے قطع نظر اگر ہم نواب سر امیر الدین والیٔ لوہارو کے اس بیان کو بغیر کسی شہادت کے مصدقہ مان لیں تب بھی کچھ اور مسائل ہمارے درپیش ہوں گے اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ غالب کا گھر (باقی صفحہ ۶۶ سے)

قید فرنگ کا یہ سانحہ غالب کے حق میں تمام عمر سوہان روح بنا رہا۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ جیسے رئیس اعظم جو شرفائے دلی میں ممتاز مقام رکھتے تھے قید کے زمانے میں غالب کی مسلسل

(باقی سلسلہ صفحہ ۶۵ سے) قمار خانہ تھا اور وہ اس کے مہتمم تھے تو کیا مولانا فضل حق، مفتی صدر الدین، آزردہ اور مصطفےٰ خاں شیفتہ جیسے صاحبانِ علم اتنے بے حمیت تھے کہ ایک قمار خانہ کے مہتمم کو اپنی ہم جلیسی کا شرف بخشنے میں کچھ تامل نہ کرتے جبکہ اس زمانے کے آداب معاشرت ایسے کچھ سخت اور کڑے ہوں کہ شرفا کی ہم جلیسی کے لئے ہم رتبہ اور ہم مذاق ہونا ضروری ہوتا تھا۔

اس ضمن میں غالب شناسوں کی یہ ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ ہم ایک طرف تو غالب کی رفیق حیات امراؤ بیگم کے تقویٰ کے قائل ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر کی مئے نوشی سے اس قدر نالاں تھیں کہ انہوں نے ان کے برتن تک علیحدہ کرئے تھے۔ دوسری طرف ہمیں اس الزام کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایسی پارسا اور متقی بیوی جوئے کی آمدنی سے گھر کے اخراجات کی کفالت پر معترض نہیں ہوئی۔ غالبیات کا مبتدی حیران ہو سکتا ہے کہ ایں چہ عجب بوالعجبیت۔

غالباً امراؤ بیگم کا خیال رکھتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی تصنیف آہنگ غالب میں اتنی رعایت یہ کہہ کر برتی ہے کہ "اس سے اگر شراب کا خرچ ہی نکل آتا تو یہ بھی بہت تھا" (آہنگ غالب صفحہ ۲۹)

خبرگیری اور دلجوئی کرتے تھے ان کی رہائی اور قید کی مدت میں تخفیف کے لئے بھی کوشاں رہے۔ لیکن غالب اس ذلت سے ایسے دل برداشتہ تھے کہ انھیں دلّی توکیا ہندوستان میں بھی رہنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ ان کے ایک مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے ان کے قلبی کیفیات کی کربناکی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

"میری آرزو ہے کہ میں اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے، مصر ہے، ایران ہے بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمتہ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں" [۱]

---

[۱] خواجہ الطاف حسین حالی یادگار غالب (خط بنام تفضل حسین خاں) باغ دودر ترجمہ از حالی ص ۴۱

غالب نے قید فرنگ کی صعوبتوں اور روحانی اذیتوں کا تفصیلی حالی ایک ترکیب بند جسیہ میں قلم بند کیا ہے۔ اگر یہ نظم اردو میں ہوتی تو غالباً اردو شاعری کا پہلا زندان نامہ قرار پاتی۔

غالب کی بے گناہی اور قید و بندگی اِس ذلت میں قصداً ملوث کئے جانے کا ثبوت وہ واقعات بھی فراہم کرتے ہیں جو قید سے رہائی کے بعد پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ قید سے رہائی پانے پر دلّی کے ایک صاحب طریقت بزرگ حضرت نصیر الدین عرف کالے صاحب غالب کو سیدھے اپنے گھر لے گئے۔ یہ غالب کے لئے بڑی عزت و شرف کی بات تھی کہ قید فرنگ کی ذلت و رسوائی کے بعد دلّی کی ایک بزرگ ہستی نے انھیں اپنا مہمان بنالیا تھا۔ میاں کالے صاحب بہادر شاہ ظفر کے بھی پیر و مرشد تھے اور ان ہی کی کوشش اور سفارش کی بناء پر غالب بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوسکے دوسرے یہ کہ شرفائے دلّی کے دوستانہ مراسم اور توقیری برتاؤ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس حادثہ سے غالب کی انا اس بری طرح مجروح ہوئی تھی کہ اس کی تلافی کے سامان قدرت ہی کی طرف سے دربار مغلیہ سے وابستگی کی شکل میں مہیا ہو گئے۔

۴

دربارِ مغلیہ سے وابستگی

"حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے"

۴/ جولائی ۱۸۵۰ء مطابق ۲۳/ شعبان ۱۲۶۶ھ کو غالب بادشاہ ظفر کے حضور میں پیش ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں سہ منزلہ خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ اور چھ پارچہ کا خلعت معہ تین رقوم یعنی جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید سے سرفراز فرمایا۔[1]

قلعہ معلیٰ سے وابستگی غالب کی زندگی کا ایک اہم اعزاز تھا۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں جوان دنوں مدار المہام سلطنت تھے غالب کی فارسی انشا کے مداح تھے۔ ان ہی کی ایما پر غالب کو خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپے ماہوار پر مامور کیا گیا۔ خطاب اور خلعت غالب کے کمال فن کے اعتراف میں تھا تو تاریخ نویسی کی خدمت ان کی فارسی انشا پردازی کے حسن قبول کی دلیل تھی۔ اس تاریخ کے لئے غالب نے جو نام تجویز کئے ان ہی سے ان کی ادبی اور شعری اختراعات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ تیموریہ کے دو حصے قرار پائے پہلے حصے کا نام مہر نیم روز اور دوسرے حصے کا ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ ماہ نیم ماہ کی اختراع پر خود غالب کو بھی فخر تھا۔ مکمل تاریخ کا نام پرتوستان رکھا تھا۔ مہر نیم روز غالب کا پہلا درباری کارنامہ تھا جو نثر فارسی میں انجام پایا۔ شاہان تیمور کی تاریخ کا یہ پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمایوں تک کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا ۱۸۵۲ء میں تکمیل پایا اور ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوا۔[2] تاریخ کا دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ جس میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات قلم بند کئے جانے تھے لیکن زمانے نے اس کی مہلت ہی نہ دی سن ستاون کے انقلاب نے تاریخ تیموریہ کے اس آخری ورق ہی کو الٹ دیا۔

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ صفحہ (۳۳)

[2] شیخ محمد اکرام۔ "غالب نامہ" ماخوذ صفحہ (۱۰۹)

اگر غالب کے قلم سے یہ تاریخ مکمل ہو گئی ہوتی تو غالب کی فارسی نگارشات میں دستنبو کی طرح ایک خاصے کی چیز ہوتی [۱]

دربار مغلیہ سے وابستگی کے بعد غالب کی ادبی معرکہ آرائیوں نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا۔ غالب کے اسلوب شعری میں قدرے تبدیلی آئی۔ چنانچہ اس دور کی بعض غزلیں سہل ممتنع کی عمدہ مثال سمجھی جاتی ہیں۔ ذوق حالانکہ استاد شہ تھے اور ملک الشعرائی کے منصب پر فائز تھے اس کے باوجود غالب نے کبھی انھیں اپنا ہمسر نہیں جانا اور ان سے الجھنے میں بھی غالب کوئی لطف نہیں محسوس کرتے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں شہزادہ جواں بخت کے سہرے میں اتفاقاً سخن گسترانہ بات آپڑی تھی اور بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو شہ دے کر غالب کے مقابل لانا چاہا تھا لیکن غالب نے کمال خوبی سے اپنا دامن بچا لیا اور بادشاہ وقت کو بھی یہ احساس دلانے سے نہیں چوکے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

روایت شکن غالب نے اس معاملہ میں بھی میر ضاحک اور سودا اور انشاء و مصحفی کی معاصرانہ چشمک کی قائم کردہ روش سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ یوں بھی ذوق اور غالب میں مقابلہ کا کوئی میدان ہی نہ تھا۔ ذوق قصیدے کے بادشاہ تھے اور دلّی کی ٹکسالی زبان پر جان دینے والے جبکہ غالب میدان غزل کے بزدپیشہ اور فارسی کے دلدادہ تھے۔ فارسی کے باکمالوں کی ہمسری کا زبردست شوق مرزا کی ذات و صفات اور ان کے فن کے فروغ کا اصل محرک رہا ہے۔ ان کا تخیل بار بار ان ستاروں کی ہم نشینی کا آرزو مند رہا ہے جو کبھی

---

[۱] اسی تصنیف کے دیباچے میں غالب نے اپنی نسلی برتری کی گنجائش نکال لی ہے اور اپنے خاندان کے سمرقند سے ہندوستان آنے کے واقعہ کو بلندی سے پستی کی طرف آنا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ "چوں سیل از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد" یہ گویا اس سطح سے اپنی حیثیت کو منوانا تھا جو نسب ناموں سے متاثر ہوتا تھا۔

عجمی ادبیات کے آفاق کی زینت تھے۔ ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

"دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا ہے[1]۔

اسی تناظر میں غالب کا اردو شاعری پر فارسی کو ترجیح دینے کا رجحان اور "فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" کہنے کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اردو میں شعر گوئی کے باوجود انہوں نے فارسی کو یکلخت ترک نہیں کیا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر قصائد و قطعات جو بادشاہ اور شہزادوں کی تعریف میں کہے گئے فارسی ہی میں ہیں۔ بعض مدحیہ قصیدے اردو میں بھی ہیں لیکن فارسی کے مقابلہ میں ان کا پایہ اتنا بلند نہیں ہے[2]۔ ان قصائد

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگارِ غالب حصہ دوم صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴

[2] کلیات فارسی میں غالب کے کوئی پندرہ قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے جب غالب کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپے سالانہ مشاہرہ مقرر ہوا تو غالب نے ولی عہد کی تعریف میں بھی چند قطعات اور تین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے۔ ان میں ایک قصیدہ کی تشبیب میں روزانہ کی دلچسپ روداد لکھی ہے اور ایک قصیدہ فارسی کے آدم الشعرا رودکی کے مشہور قصیدے "بوئے جوئے مولیاں آید ہمے" کی بحر میں ہے ؎

داد سلطان نشاں آید ہمے	مہر ورد گیتی ستاں آید ہمے
شہریاراں نکتہ داں بودہ اند	شہریار نکتہ داں آید ہمے

کی تہ میں کارفرما غالب کے اس جذبۂ شوق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ملک الشعراء کے اس اعلیٰ منصب کے حصول سے وابستہ تھا جسے مغلوں کے تمدنی نظام میں بڑے شرف و فضیلت کا مقام سمجھا جاتا تھا اور جس پر کبھی غزالی مشہدی، فیضی، طالب آملی اور کلیم ہمدانی جیسے عظیم شعراء فائز رہے اور مغل دربار کے ملک الشعراء کہلانے میں فخر محسوس کیا ہے۔ غالب، ذوق سے زیادہ خود کو ان کا جائز جانشین گردانتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر شہریار سخنور بھی تھے اور اکبر و جہانگیر اور شاہجہاں کے آخری فرزند بھی چنانچہ غالب بہادر شاہ ظفر کو بار بار یہ احساس دلاتے رہے کہ وہ فن کی قدر دانی اور داد سخن میں مغل دربار کی فیاضانہ روایات سے انحراف نہ کرے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں اپنے مداحوں کو چاندی سونے میں تلوا گئے اور میرا کلام زر میں نہ سہی بلکہ میزان سخن دانی میں کلام کلیم کے ساتھ رکھ دیا جائے۔ؔ[۱]

سرکاری وظیفہ کی منظوری، قلعہ کی تنخواہ، شہزادوں کی اتالیقی کا معاوضہ اور شاہانہ الطاف و اکرام کے سبب قلعہ سے وابستگی کا زمانہ غالب کے حق میں قدرے خوش حالی کا زمانہ تھا یعنی ۱۸۵۲ء تک جبکہ تاریخ تیموریہ کا پہلا حصہ مہر نیم روز تکمیل کو پہنچا۔[۲]

---

[۱] مہر نیم روز کے دیباچہ کے حسب ذیل اقتباس میں غالب کی اسی آرزو نے جذبۂ بے اختیار شوق کی صورت اختیار کرلی ہے۔

"شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے"۔ (خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ دیباچہ ص ا)

[۲] ۱۸۵۲ء میں مومن نے وفات پائی۔ غالب اپنے ہم عصر شعرا میں مومن کے بڑے معترف تھے ان کی موت پر غالب نے گہرے تاسف سے کہا تھا ؎

کافر باشم اگر بمرگ مومن ‏ ‏ ‏ چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال کے بعد غالب استاد شہ کے منصب پر فائز ہوئے اور اگر زمانے نے ظفر کو کچھ مہلت دی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ غالب کی وہ دیرینہ آرزو بھی بر آجاتی کہ ان کا کلام "کلام کلیم کا ہم قدر قرار پاتا"۔ لیکن سن ستاون کے خونیں انقلاب نے حیات غالب کے اس زریں ورق کی سرخی پر سیاہی پھیر دی۔

تاہم اس درباری دور کی یادگاروں میں مدحیہ قصائد، قطعات، چند تاریخی سہرے، ایک مثنوی دفع الباطل کے علاوہ غالب کا وہ اردو دیوان ہے جس کی بدولت غالب کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔

(باقی سلسلہ ۷۴ صفحہ سے) ۱۸۵۲ء ہی میں غالب کے جواں سال بھانجے مرزا زین العابدین خاں عارف کی موت کا سانحہ پیش آیا۔ عارف سے غالب کو غایت درجہ محبت تھی جو انھیں اپنے لڑکے کی طرح عزیز تھے۔ دیوان ریختہ میں ایک غزل بطور نوحہ کے اس قلبی صدمے کی یادگار ہے۔

۵

ہنگامۂ غدر

"مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی"

غدر کے خوں آشام واقعات کے تناظر میں اگر غالب کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شخصیت کے چند اہم گوشے ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ ان دنوں غالب دلّی کے مشہور محلے کوچہ بلی ماراں میں شریف خانی خاندان کے حکیموں کے پڑوس میں سکونت پذیر تھے۔ یہ لوگ مہاراجہ پٹیالہ کے طبیب خاص تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سیاسی مصلحت کے مدنظر انگریزوں کے وفادار تھے اسی بنا پر انہوں نے انگریزوں سے اس بات کی طمانیت حاصل کر لی تھی کہ فتح کی صورت میں حکیموں کے گھرانوں کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ چنانچہ فتح دلّی کے بعد انگریز سپاہیوں کے ساتھ مہاراجہ پٹیالہ کے بھی چند سپاہی حکیموں کے محلہ میں متعین کر دئے گئے تھے اور اسی پہرہ کی بدولت غالب بھی محفوظ رہ سکے۔ ان ہنگاموں کے دوران غالب نے خود کو گھر کی چار دیواری میں محصور تو کر لیا تھا لیکن جانتے تھے کہ خواہ مجاہدین آزادی کا ساتھ دیں یا انگریزوں کا دونوں صورتوں میں موت کا خطرہ لاحق ہے وہ کسی وقت بھی کالوں یا گوروں کی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ اس لئے غدر کی، دار و گیر سے اپنے بچ جانے کو معجزہ سے کم نہ جانتے تھے[1]

---

[1] غدر کے بعد کی انتقامی کارروائیوں میں انگریز حکام کی دار و گیر سے خود حکیم محمود خاں اور غالب بھی نہ بچ سکے۔ ان دنوں دلّی کا ہر محلہ باری باری انگریز حکام کے گھیراؤ یا حلقوں کا شکار ہو رہا تھا جس محلہ میں حلقہ ڈالا جاتا وہاں کے بچے بوڑھے اور جوان سیدھے چاندنی چوک کے مقتل لے جائے جاتے جہاں لٹک۔ (باقی صفحہ ۸۰ پر)

غدر کے ان ہی پر آشوب ہنگاموں میں جبکہ قلزم خوں سر سے گزر رہا تھا غالب گوشۂ عزلت میں بیٹھے غدر کی حکایات خونچکاں رقم کرتے رہے۔ کہنے کو تو یہ روزنامچہ تھا لیکن ستم زدگان دلی کی داستانِ الم رقم کر گئے۔ یہ یادداشت حالات غدر کے محققین کے حق میں ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی نا آمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔۔۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے" [۱]

اس خالص تاریخی نوعیت کی تصنیف میں ادبیت کا پہلو اس طرح نکال لیا کہ اس کی زبان فارسی قدیم رکھی [۲] غدر کا تاریخی نام "رستخیز بیجا" غالب ہی کے ذہنی اپج کا نتیجہ ہے۔ غدر کے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد غالب نے دستنبو کے قابل گرفت مواد کو حذف کر کے نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع کر دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی اس نثر کے ساتھ شامل کر کے ایک نسخہ ولایت بھیجنے کا اہتمام بھی کیا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ غالب کا یہ اقدام سر سید

(باقی سلسلہ صفحہ ۷۹ سے) پھانسی کے پھندوں سے ان کا بچ آنا محال تھا۔ ان دنوں انگریزوں کا جوش انتقام جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس انتقامی عدالت کا نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون نہ داد نہ انصاف اور نہ کسی کو اپنی صفائی میں زبان کھولنے کی اجازت تھی۔ اسی کیفیت کے بارے میں غالب نے کہا تھا ؎

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا

[۱] مرزا غالب۔ عود ہندی۔ مکتوب بنام انور الدولہ سعد الدین خاں شفق ص (۸۲)

[۲] مرزا غالب۔ اردو ئے معلّٰی مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ۔ ص (۴۳)

کہ رسالہ اسباب بغاوت ہند کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہو۔

ایام غدر کی اس محصوری کے دوران غالب پر کئی قیامتیں گزر گئیں۔ بیوی کی بیش قیمت زیورات جو میاں کالے صاحب کے یہاں بہ غرض حفاظت رکھوائے گئے تھے گوروں کی لوٹ میں جاتے رہے۔ غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے انتقال کی خبر بھی ان ہی ہنگاموں کے دوران آئی۔ غالب اپنے بھائی کی تدفین کے لئے گھر سے باہر قدم بھی نہیں رہ سکتے تھے اپنے بھائی کی بے کسی پر دل مسوس کر رہ گئے ان پے بہ پے صدموں پر حیران تھے دل کو روئیں کہ جگر کو پیٹیں مگر ترک زادگی کا تقاضہ یہ تھا ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ان متواتر صدموں کے باوجود غالب زمانۂ غدر کی اسی قید تنہائی میں روزنامچہ (دستنبو) کی موقوفی کے بعد جب کوئی اور سامانِ غور و فکر ہاتھ نہ آیا تو قطب شاہی عہد کی مشہور لغت برہان قاطع ہی کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ اس مطالعہ کے دوران لغت کی تمام غلطیوں کو از اول تا آخر جمع کرتے گئے اور کہیں کہیں چوک بھی گئے اس طرح لغت کے اختتام پہ جب ایک وقیع رسالہ تیار ہو گیا تو اپنی دانست میں زبان فارسی کی خدمت سمجھ کر قاطع برہان کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع کیا اس زمانے میں چونکہ محمد حسن تبریزی کی لغت برہان قاطع کی ہندوستان کے فارسی داں طبقے میں بڑی اہمیت تھی اور لوگ محمد حسن تبریزی سے عقیدت رکھتے تھے۔ غالب کی طرف سے شائع ہونے والی تنقید قاطع برہان کے سبب ایک تہلکہ مچ گیا اور مجادلہ کلکتہ کی ہنگامہ آرائیاں ازسرنو تازہ ہو گئیں۔

مرزا غالب کو صاحب برہان سے کوئی خصوصی پرخاش نہیں تھی بلکہ وہ اپنی اصول پسندی سے مجبور تھے وہ تو ان تمام فارسی لغات نویسوں کو غیر مستند گردانتے تھے جن کے جامع ہندی تھے۔ عقیدت مندانِ برہان اور طرف دارانِ قتیل غالب کے کسی استدلال کو سننے کے روادار نہیں تھے۔ اور غالب خلاف جمع ایک طویل ادبی

معرکے میں الجھ گئے۔ جس کے نتیجہ میں نثریات غالب میں قاطع برہان کے علاوہ درفش کاویانی تیغ تیز، نامۂ غالب، لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم جیسے علمی رسالوں کا اضافہ ہوا۔ غالب نے کہیں بھی لغت نویسی کے فن میں ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن فارسی دانی کے معاملہ میں وہ اپنی حیثیت کو مسلم گردانتے تھے اور کسی کے دعوے کو قبول کرنے تیار نہ تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ۔

"شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنوران ہند میں امیر خسرو بھی ایسے ہی ہیں" [۱]

تاہم غالب کو اس اصول پسندی کی قیمت بھی چکانی پڑی۔ لوگ فارسی لغت کی مدافعت کم اور غالب دشمنی میں پیش پیش رہے [۲] اور تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ

---

[۱] ویسے قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً ہر زبان کا جامع لغت اور قواعد زبان کا مرتب غیر زبان داں ہی ہوتا ہے جو اس زبان کو بالالتزام سیکھتا ہے۔ چنانچہ عربی کی لغت اکثر عجمیوں نے لکھی ہے اور فارسی کے لئے ہندوستان کے مختلف زبانوں کے مستشرقین نے فرہنگ نویسی کا اہتمام کیا ہے۔ غالب سے اس ضمن میں کسی قدر سہو ضرور ہوا کہ وہ اہل ایران سے فارسی فرہنگ نویسی کے خواستگار رہے۔

[۲] غالب برہان قاطع کی تصحیح میں کس حد تک اصول پسند تھا اور کس حد تک خود پسند آج بھی محققین کا دلچسپ موضوع ہے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد جیسے بلند پایہ محققین کے محاکمے بہ عنوان غالب بہ حیثیت محقق، فن لغت نویسی اور غالب وغیرہ قابل ذکر ہیں اس موضوع پر ہنوز تحقیقات جاری ہیں اور نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ لیکن تاسف کا مقام تو یہ ہے کہ طرف داران قتیل اور معتقدان برہان کی طرف سے غالب کی شخصیت کو جس طرح ہدف تنقید بنایا گیا وہ ایک خالص علمی نوعیت کے مباحث کے وقار کے منافی تھا۔ گمنام خطوط کے ذریعہ غالب کی دل آزاری میں جو اوچھا طریقہ اختیار کیا گیا وہ اس وقت کی دلّی (باقی صفحہ ۸۳ پر)

یہ تمام ہنگامے عین اس زمانے میں برپا تھے جب غدر کی خوں آشام انتقامی کارروائیاں شدت سے جاری تھیں۔ غالب ایک طرف تو دلی کے ماتم دار ہیں اور دوسری طرف ان ادبی معرکوں سے بھی برسرپیکار رہیں۔

اسی زمانے میں غالب کے سر سکہ کہنے کا الزام بھی آیا ہے۔ یہ ناگہانی افتاد ایسی پڑی کہ انگریز حکام نے غالب کا آبائی وظیفہ مسدود کر دیا۔ غالب نے ہر چند اپنی صفائی پیش کی اور ثابت کرنا چاہا کہ سکہ انہوں نے نہیں بلکہ ذوق نے کہا تھا لیکن انگریز سرکار میں غالب کی ایک نہ چلی غالب کو اپنی برأت کے لئے وہ اردو اخبار درکار تھے جس میں محمد باقر نے اپنے دوست شیخ محمد ابراہیم ذوق کے سکے چھاپے تھے۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود غالب کو مطلوبہ اخبار دستیاب نہیں ہو سکے۔ ایک مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے ان کے دلی اضطراب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"... سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرّا یا گولی۔ مگر اب کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں" [۱]

ان تمام صدموں پر مستزاد یہ کہ غالب کا تخلیقی سرمایہ بھی غدر کی نذر ہو گیا چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک مکتوب کے نام افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں ــــ

"بندہ پرور میرا کلام کیا نظم کیا نثر۔ کیا اردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے

(باقی سلسلہ صفحہ ۸۲ سے) کی تہذیب اور شائستگی کے منافی تھا جو آج بھی بدنما داغ کی طرح اوراق ادب کے پیراہن میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو مقدمہ کی وہ روئداد جس کی مکمل نقل مولوی عبدالحق کی تحقیق سے دستیاب ہو سکی اور احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد میں ایک مضمون کے ساتھ شامل ہے۔

[۱] مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ۔ مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ ص ۱۳۲

سوا ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے
کتب خانے بھی گئے اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے
ہیں۔ خود اس مثنوی کے واسطے خوں در جگر ہوں۔ ہائے کیا چیز
تھی"[۱]

ایسے سخت صبر آزما حالات میں غالب کی مستقل مزاجی میں ایک قلندر صفت انسان کی بے نیازی اور مستقل مزاجی ملتی ہے۔ غالب صوفی نہیں تھے مگر شیوۂ تسلیم و رضا میں وہ صوفی سے کم نہ تھے۔ ذیل کے اقتباس سے ان کی قدرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو جو مجھ پر گمان
ہے اور اس کا رنج ہے یہ خلاف واقع کسی نے آپ سے کہا ہے۔ میں
مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔
دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا
کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس
مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا"[۲]

بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے نتیجے میں غالب درباری وظیفے سے تو محروم ہو ہی چکے تھے۔ سکہ کے الزام کے سبب سرکاری وظیفہ بھی مسدود ہو گیا۔ بیوی کے قیمتی زیورات سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ایک کنبہ کی پرورش ان کے سر تھی۔ قدیمی ملازمین اور متوسلین کی خبر گیری بھی ان کی ذمہ داری تھی اور ان سب سے عہدہ برآ ہونا ان کی وضعداری تھی اور یہی اس دور کی تہذیبی قدروں کا تقاضا بھی تھا۔ اس ضمن میں رشید احمد صدیقی کے تجزیاتی مطالعہ کا حسب ذیل اقتباس مبنی بر حقیقت ہے۔

---

[۱] مرزا غالب اردوئے معلیٰ۔ مکتوب بنام چودھری عبد الغفور سرور ص ۱۲۹

[۲] مرزا غالب اردوئے معلیٰ۔ مکتوب بنام چودھری عبد الغفور سرور ص ۱۳۴

"تنگدستی نے مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ تنگدستی عیش و اسراف کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس غیرت اور دردمندی کا انجام تھی جو اپنی تنگدستی کے باوجود دوسروں کی تنگ حالی دیکھ نہ سکتی تھی۔ تنگدستی میں بھی کشادہ دستی کا ایک مزہ ہے جسے مرزا نے بڑی خوش دلی سے تمام عمر نبا ہا" [1]

غالب ولایتی حکمرانوں سے اپنے درباری منصب و مقام کی برقراری پر مصر رہے اور اپنے آبائی وظیفہ کی بحالی کے لئے ان کی کوشش برابر جاری رہیں۔ اور غدر کے بعد کے انتشار و افراتفری کے اس عالم میں بھی جبکہ خود ان پر سکہ کہنے کا الزام آیا ہوا تھا اور تحقیقات جاری تھیں، غالب اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوئے بلکہ قصیدہ مدحیہ ملکۂ انگلستان کے نام لکھ کر سمندر پار کے غیر ملکی دربار سے نسبت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غالب ایک شکست خوردہ قوم کے نمائندے ہونے کے باوجود نو وارد حکمرانوں سے ان کا یہ تقاضہ کہ انھیں ملکہ کا درباری شاعر مقرر کیا جائے اور دربار میں اونچی جگہ دی جائے نہ صرف اپنا بلکہ اپنی قوم کے وقار کو بلند رکھنے کی ایک سعیٔ بلیغ متصور ہوگی۔ درباری شاعر تو نہیں بنائے گئے البتہ ان کا خاندانی وظیفہ اور منصب حسب سابق بحال کر دے گئے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد سرکاری وظیفہ و منصب کی بحالی پر غالب نے اپنے مکتوبات میں جس طمانیت کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پنشن کی بحالی کو اپنی عزت و وقار کی بحالی کے مترادف سمجھتے تھے۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"خزانے سے روپیہ آگیا۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی، حاسدوں کو موت آگئی، دوست شاد ہوگئے میں سمجھا ہوا تھا کہ جب تک جیوں گا ایسی رہوں گا ... میرا ... اسرار الٰہی ہے ان ... کا ہاتھ۔ یہ انا نطیعہ ید اللّٰہی ہے" [2]

---

[1] رشید احمد صدیقی، مضمون "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" نقد غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۳۱۷

[2] مرزا غالب، اردوئے معلّٰی مکتوب بنام میر مہدی مجروح ص ۱۷۵

(٦)

دربارِ رامپور

"واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں"

دلّی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد دربار رامپور نے علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک مخصوص تاریخ بنائی ہے۔ اس دربار سے فیض یاب ہونے والے بے شمار اصحاب علم و فضل میں بعض اشخاص ایسے ہیں جن کی وجہ سے رامپور کو ابدی شہرت نصیب ہوئی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، شعراء میں غالب، داغ اور حضرت امیر مینائی وغیرہ کے نام سرِفہرست آتے ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی وساطت سے غالب دربار رامپور سے تعلق پیدا کر سکے۔ یوں بھی نواب رام پور یوسف علی خاں کا غالب کی سرپرستی قبول کرنا ایک فطری امر تھا۔ اس لئے کہ نواب صاحب قیام دلی کے زمانے میں غالب سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ غالب سے ان کے خاندانی روابط تھے اور نواب یوسف علی خاں کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی تھی۔ انہوں نے عربی جہاں مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی وہیں فارسی مرزا غالب اور خلیفہ غیاث الدین مصنف غیاث اللغات سے پڑھی۔ آگے چل کر جب نواب یوسف علی خاں ۱۸۵۵ء میں ریاست رامپور کے مسند نشین ہوئے تو مرزا نے اس پُر مسرت موقع پر مختصر سا قطعہ تاریخ جلوس اپنے قدیم شاگرد کی خدمت میں ارسال کیا۔[۱]

سن ستاون کے انقلاب کے بعد غالب جن صبر آزما حالات سے دوچار تھے اس وقت رامپور کی مدد ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ دربار رامپور کے اردو پر جو بے شمار

---

[۱] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ۔ صفحہ (۱۴۱)

احسانات ہیں ان میں یہ دو قابل ذکر ہیں ۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے غالب کی بروقت مدد کی دوسرے غالب کا اردو دیوان اگر غدر سے پہلے رامپور نہ پہونچ گیا ہوتا تو آج اردو کا دامن اس گنج گرانمایہ سے تہی ہوتا ۔

نواب یوسف علی خاں جو مرزا سے دہلی میں فارسی پڑھ چکے تھے اب فن شعر گوئی میں بھی ان کے شاگرد ہوئے اور دربار سے سو روپے بطور ماہوار مشاہرہ مقرر ہوئے ۔ اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً وہ غالب کی مدد کرتے رہتے تھے ۔ ان کی تو دلی خواہش یہی تھی کہ غالب مستقل طور پر رامپور میں سکونت اختیار کرلیں اور اس کے لئے انہوں نے مزید سو روپے کی پیش کش بھی کی تھی لیکن غالب سے دلّی نہ چھوٹی ۔

۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء یعنی نواب یوسف علی خاں کی وفات تک غالب کے تعلقات دربار رامپور سے انتہائی خوشگوار رہے ۔ نواب کلب علی خاں جب ان کی جگہ مسند نشین ہوئے تو انہوں نے بھی غالب کو یہ یقین دیا کہ دربار رامپور سے ان کا مشاہرہ بدستور جاری رہے گا اور لطف و اکرام میں کسی قسم کا فرق نہیں آئے گا ۔ ان کی مسند نشینی کے موقع پر اول تو اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے سبب حاضر نہ ہونے کی معذرت چاہی اور ایک قصیدہ تہنیت نامہ بذریعہ ڈاک بھجوایا تھا لیکن چند ماہ بعد مسند نشینی کا باقاعدہ جشن منایا گیا تو مرزا کو رامپور جانا پڑا ۔ چنانچہ ۱۲ / اکتوبر ۱۸۶۵ء کو جشن میں شرکت کے لئے رامپور پہنچے ۔ اس جشن کے شان و شوکت اور داد و دہش کا حال مرزا غالب نے اپنے خطوط میں لکھ کر رامپور کے دورِ آخر کی ایک جھلک کو تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے ۔ بقول شیخ محمد اکرام مرزا کا دوسرا سفر رامپور مالی اعتبار سے بالکل ناکام نہ تھا ۔ اس لئے کہ مولوی امتیاز علی عرشی کے تذکرے کے مطابق مرزا غالب کو دربار سے ایک ہزار روپے کا عطیہ اور دو سو روپے زادِ راہ کے طور پر عطا کئے گئے تھے [۱]

---

[۱] شیخ محمد اکرام ۔ غالب نامہ ۔ ماخوذ صفحہ (۱۷۰)

رامپور سے واپسی میں سیلاب کی وجہ سے غالب کو گوناگوں دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک غزل کے حسب ذیل شعر میں اسی طرف اشارہ ملتا ہے ؎

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

اس حادثہ کا ان کی صحت پر اس قدر شدید اثر ہوا کہ آگے یہیں سے ایک طویل بیماری کا سلسلہ چل پڑا اور وہ آخر وقت تک مکمل طور پر شفایاب نہیں ہو سکے۔[۱]

غالب درباری آداب سے واقف ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک کامیاب درباری شاعر نہیں ثابت کر سکے۔ یوں بھی عزت نفس کی سلامتی کے ساتھ دربار داری کو نباہنا تعلید تیشۂ فرہاد سے کم نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قصیدہ خواں غالب کبھی کبھی خمیدہ گردن ضرور ہوا ہے لیکن اس کی کجکلاہی میں فرق نہیں آنے پایا۔ چنانچہ وہ بجا طور پر اس بات کے مدعی رہے کہ میرے یہاں مدح کے شعر کم ہیں اور تشبیب کے زیادہ۔

دربار رامپور سے وابستگی کے زمانے کی یادگاروں میں چند قصائد، تاریخی قطعات اور مکتوبات کے سوا غالب کا کوئی قابل ذکر تخلیقی کارنامہ نہیں ہے ان میں بھی قصائد کی تعداد کم اور مکتوبات کی زیادہ ہے۔[۲]

---

[۱] مالک رام۔ ذکر غالب۔ ماخوذ صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲

[۲] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ صفحہ (۱۳۷)

(۷)

ترجمانِ تہذیبِ دلّی

"خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات"

غالب اس دور کی دلّی کے نمایندے تھے جب دلّی کے تہذیبی و تمدنی عناصر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیائی ممالک کے لئے کشش اور جاذبیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض یوروپی قومیں اس تہذیب کے سحر میں گرفتار تھیں اور یوری تہذیبی و متمدنی کے ساتھ دلّی کی زبان، ادب اور آداب معاشرت کے مطالعہ میں مصروف تھیں۔ اس خصوص معاشرت میں آداب مجلس، آداب گفتگو کے ایسے بندھے ٹکے اصول تھے جن کا احترام طبقۂ خواص ہی پر نہیں بلکہ طبقۂ عوام پر بھی لازم تھا۔ مرزا غالب کا تعلق بھی اُس طبقۂ خواص سے تھا جن کے اخلاق و عادات کا معیار کہیں اونچا ہوتا تھا۔ غالب نے تو آگرے کے رئیسانہ ماحول میں پرورش پائی اور ہوش سنبھالا تھا اور شادی بھی دلّی کے رئیس ابن رئیس گھرانے کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ آگرہ اور دلّی دونوں مغل تہذیب کے گہوارے تھے۔ اس لئے میر کی طرح غالب بھی خود پسندی، خودداری اور وضعداری کے سودائی تھے۔ دونوں کا خمیر آگرے کی متمدن سرزمین سے اٹھا تھا دونوں کی سرشت میں نازک دماغی تنک مزاجی اور قدرے سرکشی بھی تھی۔ شاعری تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی اس امتحان سے غالب جب دلّی آئے تو دلّی کی تہذیب کو اپنے میں سمو لینا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت کے ہر پہلو میں دلّی کی تہذیب کے خط و خال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ حالی کے بیان کردہ واقعات کے مطابق ایسے بیشتر اوصاف جو ان کی شخصیت کو دلکش،

وبہ اثر بنانے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں وہ حسن اتفاق سے غالب کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے مثلاً خوش خلقی، شگفتہ مزاجی، احباب پسندی، اقربا پروری شاگرد نوازی اور ان سب سے بڑھ کر غالب کی صوفی منشی اور رند مشربی جس نے غالب کو صلح کل طبیعت عطا کی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام خوبیاں کچھ غالب ہی کی ذات سے مختص نہیں تھیں بلکہ اس دور کی تہذیب کا خاصہ تھیں مگر غالب کی خوبی یہ ہے کہ ان اخلاقی قدروں کو سخت آزمائش کی گھڑیوں میں بھی سنبھالے رہے اور اپنی وضعداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے مغل دور آخر کی ایک نمائندہ شخصیت کے ہر پہلو کو اوراق ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس ضمن میں ذیل کا اقتباس غالب کی شخصیت اور سیرت کا خلاصہ متصور ہوگا۔

> "اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اس کا اندازہ کرنے سے عاجز تھا، پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہئے تھا نہیں بٹھا سکے مگر وسعت اخلاق حسن معاشرت اور صلح کل مشرب سے انہوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہواخواہوں کی تعداد بھی سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا حیرانگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو غصہ کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور ان کی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاس وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور

ہر مذہب و ملّت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص
سے ملنا اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دار الخلافہ کی قدیم
سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں ان کی ذات میں جمع تھیں [۱]
خلعت بیچ کر انعام دینے کی بات ہی کیا ہے [۲] جبکہ غالب کا حوصلہ تو یہ تھا کہ
وہ ایک عالم کی میزبانی کے تمنائی تھے مگر غالب کو حسرت تھی تو اس بات کی

---

[۱] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ حصہ دوم (نظم و نثر فارسی صفحہ ۲۲۳)
[۲] خلعت بردار شاہی چوبداروں کو انعام سے سرفراز کئے بغیر خالی ہاتھ لوٹا دینا اس
عہد کی جاگیردارانہ روایات اور وضعداری کے منافی تھا۔ ایسے نازک مرحلہ پر غالب
کی تہی دستی ایک کڑی آزمائش بن گئی اگر غالب نے اس وقت فراخ دلی سے کام نہ لیا
ہوتا تو ایک طرح سے ان کی سبکی ہوتی دوسرے ان کی وضعداری پر ہمیشہ کے لئے حرف
آجاتا۔ چنانچہ انہوں نے اس شاہی خلعت کو فروخت کرکے چوبداروں کو انعام واکرام کے
ساتھ لوٹایا جس کے حصول کی خاطر انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ (خواجہ الطاف حسین
یادگار غالب ماخوذ صفحہ ۶۳)

غالب کی عالی حوصلگی اور وضعداری کا ایک چشم دید واقعہ جلیل مانک پوری
نے حضرت امیر مینائی کے حوالے سے قلم بند کیا ہے جس سے غالب کی شخصیت کا ایک متاثر کن
پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ جلیل مانک پوری لکھتے ہیں۔

"رامپور میں غالب سے ایک سقے نے امداد طلب کی تھی کہ لڑکی
کا عقد درپیش ہے۔ انہوں نے امداد کا وعدہ کر لیا۔ اتفاق سے
رامپور سے رخصت ہو کر دلی کو چلے اور رخصتانہ نہ ملا۔ شاید نواب
صاحب کو خیال نہیں رہا تھا۔ حضرت امیر مینائی کو خیال آیا تو نواب
صاحب سے عرض کرکے رخصتانہ بھجوایا۔ ان کی پالکی شہر سے
باہر جا چکی تھی چوبداروں نے پہنچ کر رقم پیش کی (باقی صفحہ ۹۸ پر)

تھی کہ قدرت کی طرف سے ودلیعت کردہ صفات میں لبقدرِ ایک ظہور میں نہیں آسکے۔
ذیل کا ایک مکتوب اسی کرب ناتمامی کا شاہد ہے ۔

"قلندری و آزادگی، ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در در بھیک مانگے وہ میں ہوں"[1]

میر کی طرح غالب کی زندگی میں بھی نشیب و فراز آئے، مالی مشکلات و خستہ حالی کا شکار رہے۔ وظیفہ کے مقدمہ کی روبکاری، اہل کلکتہ کی دل آزاری، دربار سے وابستگی کے لئے جدوجہد ان سب پر مستزاد عہد غالب کا عظیم ترین سانحہ سن ستاون کا انقلاب اور غدر کے بعد کے دل دوز واقعات، دوست احباب کی جدائی کا غم، دلی کی بربادی کا ماتم، وظیفے کی مسدودی، تنگدستی و عسرت کی زندگی، ایک کسمپرسی کا عالم غرض ایسے بیسیوں ہمت شکن حالات تھے جن سے غالب زندگی بھر دوچار رہے۔ غالب کی

(باقی صفحہ ۹۷ سے) مرزا صاحب نے پالکی وہیں رکھوالی اور چوبداروں سے کہا فلاں سقے کو میرے پاس بھیجو میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں غرض جب وہ آیا اور اس کو روپیہ دے چکے تب پالکی اٹھائی گئی" نواب فصاحت جنگ جلیل، سوانح امیر مینائی صفحہ ۶۹، مطبوعہ ۱۳۴۷

[1] مرزا غالب۔ اردوئے معلی بنام مرزا علاء الدین احمد خاں صفحہ ۳۸۳

شخصیت میں کارفرما نرک ہر جگہ ایک نئی آب و تاب دکھاتا رہا ۔ وہ مصائبِ زندگی کی ہر آزمائش سے بخوبی گزرے اور ہر موڑ پر سرخ رو رہے۔ جس سے یہ آگہی ملتی ہے کہ غالب کی فطرت میں سپرتر فولاد بھی ہے اور خوئے حریر و پرنیاں بھی۔ ان میں دنیا داری بھی ہے اور آزاد منشی و قلندری بھی ۔ غالب کے کلام میں بھی یہ احساس جھلکتا ہے کہ غالب جیسا آزاد منش اور قلندر مزاج شاعر کہاں اور یہ وبال کہاں ۔ مگر ان ہی حالات میں مرنا جینا ٹھہرا پھر بھی ان کے حریفانہ تیور اور حسِ مزاح نے انھیں زندہ و توانا رکھا اور سب کچھ جھیل گئے۔ ان حالات میں اگر کوئی معمولی دل و دماغ کا انسان ہوتا تو کبھی کا زندگی سے برگشتہ ہو جاتا لیکن انہوں نے خود کو غم کا خوگر بنا لیا' زندگی کی سختی سے سخت مشکلوں کو نہ صرف اپنے اوپر آسان کر لیا بلکہ مشکلات اور غم کا ایک فلسفہ بھی معلوم کر لیا یعنی آرزوؤں سے دستبردار نہیں ہوئے اور غموں پر مسکرانا سیکھ لیا ۔ غموں پر مسکرانے اور اپنی کمزوریوں پر ہنسنے کا سلیقہ بھی غالب ہی نے سکھایا ہے یہ ایک طرح سے غالب کی خود احتسابی ہے ۔ اس سلسلہ میں غالب کا رویہ کیا تھا اس کا علم ان کے مکتوبات کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے [۱]

غالب کے مذہبی عقائد کا خلاصہ حالی نے صرف دو جملوں میں بیان کر دیا ہے لکھتے ہیں ۔

"انہوں نے تمام عبادات و فرائض اور واجبات سے دو چیزیں لی تھیں ایک توحیدِ وجودی اور دوسری

---

[۱] میر قربان علی بیگ سالک کے نام لکھتے ہیں ۔

"اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوا، آج دور دور تک میرا جواب نہیں ۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ۔ بڑا کافر مرا ..."

(مرزا غالب ۔ اردوئے معلیٰ ۔ ص ۳۱۲)

بنی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت بنی صلعم کی محبت "[۱]

غالب اہلِ طریقت سے بھی عقیدت رکھتے تھے ۔ بقول محمد حسین آزاد ۔

"مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلوی کے خاندان میں بیعت تھی "[۲]

عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے مسلک کا اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ مذاہب کے ظاہری رسوم و قیود کی پابندی کی بجائے ان باطنی خوبیوں پر زیادہ زور دیتے تھے جو تمام مذاہب کی قدر مشترک سمجھی جاتی ہیں یہی غالب کی نظر میں اصل ایمان ہے ۔ ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

"مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سایہ میں ہے ۔ وہ تسبیح حی پر وہ اسمائے الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہے اور وہ دانہ اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں ۔ کعبہ اور دیر کلیسا و کنشت اس وقیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں ۔ جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہے ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

... انہوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کر دیا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں "[۳]

---

[۱] خواجہ الطاف حسین حالی ۔ یادگار غالب صفحہ ۵۷ مطبوعہ ۱۸۹۷ء

[۲] محمد حسین آزاد ۔ آب حیات صفحہ ۵۱۳

[۳] عبدالرحمٰن بجنوری ۔ محاسن کلام غالب صفحہ ۴۵ ۔ ۴۶

غالب کے اسی مذہبی نقطہ نظر نے انھیں بڑا وسیع المشرب بنا دیا تھا۔ وہ آخری سانس تک وحدت ایمان کا پرچار کرتے رہے کیونکہ اسی سے وحدت انسان کا رشتہ استوار رہ سکتا ہے اپنے ایک مکتوب میں وہ کس بے تکلفی سے کہہ گئے ہیں ملاحظہ ہو۔

"بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے باقی رہی وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں" [۱]

حضرت علیؓ سے غالب کا عشق "مطالعہ غالب" میں ایک اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محققان غالب نے حبّ علیؓ کو غالب کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک جانا ہے۔ مثنوی ابر گہر بار کو غالب کے عقائد کا منشور اور محبِ علیؓ کا صریحی اعلان سمجھا جاتا ہے [۲]

اگر غالب نے اپنے عشق کی لگام خرد کے ہاتھ میں نہ تھمائی ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ وہ خانقاہوں کی ھو حق یا سماع خانوں کے وجدانی رقص کے لئے وقف ہو جاتے۔ سرود و نغمہ کی وجد آفرینی کے غالب بھی قائل تھے ایک شعر میں انھوں نے اپنے تاثر کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

غالب نے ایک عمر تصوف کے مطالعہ میں گزار دی اور تصوف اپنی ہزار سالہ تاریخ کی ان گنت تبدیلیوں کے ساتھ غالب کے دور تک آیا تھا۔

غالب کا عہد ایک لحاظ سے مذہبی مباحثوں، مناظروں اور مختلف اصلاحی تحریکات کا عہد تھا۔ لیکن کسی تذکرے میں اس کی شہادت نہیں ملتی کہ غالب نے ان میں

---

[۱] مرزا غالب۔ اردوئے معلی۔ مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ۔ صفحہ (۵۱)
[۲] نبی ہادی۔ مغلوں کے ملک الشعراء۔ ماخوذ صفحہ (۳۲۹)

سے کسی ایک کا بھی راست طور پر اثر قبول کیا ہو۔ وہابی تحریک اس دور کی ایک طاقتور اصلاحی تحریک تھی جو بیک وقت مذہبی اور سیاسی دونوں مسائل سے الجھی ہوئی تھی مومن اس تحریک کے حلقہ اثر میں آئے بغیر نہیں رہ سکے۔ غالب نے اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ غالب کو رسمی مذہب سے کبھی گہرا تعلق نہیں رہا اور نہ ہی وہ مذہب میں غلو کو پسند کرتے تھے۔ غالب کے مرد خلیق ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ ہر مذہب و ملت کے افراد ان کے حلقہ بگوش تھے۔ اپنے کثیر الاحباب ہونے پر فخر بھی کرتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب زاید یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں"۔[1]

غالب کا برتاؤ اپنے شاگردوں سے ازحد مشفقانہ رہا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے مکتوبات ان کی انسان دوستی اور شاگرد نوازی کی گواہی دیتے ہیں ذیل کے اقتباس سے ان کی شفقت اور محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"سنو صاحب۔ یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں

---

[1] مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ صفحہ (۶۷)

کہیں پانی لڑھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا
تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں کیوں
گھبراؤں گا" [۱]

غالب نے اپنے شاگردوں کو باپ کی سی شفقت دی ہے، انھیں اپنی محبت کا احساس بھی دلایا ہے۔ ذیل کے خط میں کس دلار سے وہ تفتہ کو سمجھا رہے ہیں، یہی ان کی شخصیت کا دلآویز پہلو ہے ملاحظہ ہو ــــ

"میری جان آخر لڑکے ہو بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے
پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا بشرط اقامت
بلالوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں ٹھہری
تو بے تمہارے نہ رہوں گا" [۲]

جہاں شاگردوں سے اتنا پیار رکھتا دہیں ان کی تربیت میں کسی طرح کی رعایت کے وہ روادار نہیں تھے۔ خصوصاً زبان اور فن شعر گوئی کے معاملہ میں تو وہ بڑے سخت گیر تھے۔ ذیل کا اقتباس اس کا شاہد ہے۔

" دونوں غزلیں دیکھیں، خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں
فنِ شعر میں اگر اس شیوہ کی رعایت کی جائے تو شاگرد ناقص
رہ جاتا ہے" [۳]

اور جہاں جوہر قابل پاتے اس کی حوصلہ افزائی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتے۔ اس ضمن میں خود حالی کا اعتراف سب سے بڑی شہادت ہے کہ ان کی غزلوں پر اصلاح دیتے ہوئے غالب نے کہا تھا۔

---

[۱] مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ صفحہ (۶۹)
[۲] ،، ،، ،، ،، صفحہ (۶۷)
[۳] ،، ،، مکتوب بنام منشی داد خاں سیاح صفحہ (۲۳)

"اگرچہ کہ میں کسی کو فکرِ سخن کی صلاح نہیں دیا کرتا مگر تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے[۱]"

اور تاریخ شاہد ہے کہ اس مختصر بلیغ جملے نے حالی کو کس مقام پر پہنچا یا۔ داغ دہلوی کی تربیت میں بھی یہی شفقت کارفرما رہی ہے[۲]

گزشتہ پون صدی کی تنقیدی چھان پھٹک کے بعد بھی غالب کی بشری کمزوریوں اور لغزشوں کے مقابلے میں ان کی شخصیت کی خوبیوں اور اچھائیوں کا ہی پلہ بھاری رہا ہے اور اکثر صاحبانِ نقد و نظر اس بات پر یک زبان ہیں کہ

"غالب، انسان، دوست، استاد، مربی، مخدوم، خادم، شہری ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے[۳]"

شیخ محمد اکرام اپنی تصنیف غالب نامہ میں مرزا کو مغلیہ تہذیب و تمدن کا بہترین ترجمان ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"غالب نے درباری تمدن کی آغوش میں نشو و نما پائی تھی اور خاص طور پر وہ مغلوں کی نفاست پسندی، خوش معاشرتی، ذہانت، عالی حوصلگی اور اولوالعزمی کا دل پزیر نمونہ تھے یعنی جو اصول اور روایات مغل کیرکٹر، مغلیہ طرز حکومت، مغلیہ فنون لطیفہ کی امتیازی خصوصیات ہیں وہی مرزا کی شاعری اور زندگی میں نمایاں ہیں اور شاید ان خصوصیات کا اس سے بہتر ادبی اظہار اور کہیں نہیں ہوا[۴]"

خود غالب نے اپنی پہلو دار شخصیت کی لفظی تصویر ایک فارسی شعر میں کس عمدگی سے کھینچی ہے ملاحظہ ہو[۵]

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم، رحم برفریاد دادِ فغانم می آید

۱؎ صالحہ عابد حسین یادگار حالی صفحہ ۱۴۵ ۲؎ تمکین کاظمی داغ مطبوعہ ۱۹۶۰ ماخوذ صفحہ ۳۹
۳؎ حامد حسن قادری داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۱۹ ۴؎ شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ ص ۳۵۹

٨

گرہستی اور خاندانی زندگی

"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

غالب کی ازدواجی زندگی میں بھی اس عہد کی معاشرتی اقدار کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن عصرِ حاضر کے غالب شناس ان کی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں معلوم ہوتے بلکہ غالب کی متاہلانہ زندگی کی تلخیوں کو وہ ان کے کلام میں بھی محسوس کرتے ہیں [1] ۔ اس قسم کی بدگمانیوں کا سبب کچھ تو وہ لطیفے ہیں جو آبِ حیات [2] اور یادگار [3] میں ان کی بیوی امراؤ بیگم کے تعلق سے ملتے ہیں دوسرے غالب کے بعض مکتوبات کی ایسی تحریریں ہیں جن میں کہیں ان کی ظرافت آمیز شوخی جھلکتی ہے تو کبھی ان کی اضطراری کیفیت کو ظاہر کرتی ہے ۔ ان ہی کو بنیاد بنا کر غالب کو اہلی زندگی سے متنفر اور بیزار ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ ازراہِ مزاح بیوی کو کبھی بلا کہنے میں یا کبھی پانو کی بیڑی قرار دینے میں محض ان کی ظرافت آمیز شوخیٔ طبع تھی ورنہ یہ بیڑی انھیں اتنی ہی عزیز تھی کہ اس کی خوشنودی کی خاطر غالب نے پورے خلوص کے ساتھ مزید دو ہتھکڑیاں بھی پہن لی تھیں ۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کا حسبِ ذیل تبصرہ غالب شناسی کے حقیقت پسندانہ رجحان کو ظاہر کرتا ہے ۔

"لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غالب کو اپنی بیوی سے نفرت تھی ۔ کبھی نہیں ۔ بات یہ تھی کہ وہ گھریلو زندگی میں وہ اطمینان و فراغت نہیں دیکھتے تھے

---

[1] ڈاکٹر ظ ۔ انصاری ۔ مضمون "غالب کی کہانی" رسالہ شاعر غالب نمبر ص (۲۵)

[2] محمد حسین آزاد ۔ آبِ حیات ۔ صفحہ (۵۰۹) مطبوعہ ۱۹۶۲ء

[3] خواجہ الطاف حسین حالی ۔ یادگارِ غالب ۔ صفحہ (۱۷)

جو اہل و عیال کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے دل برداشتہ رہتے تھے
اور ان کا جی یہ چاہتا تھا کہ ان فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔ لیکن
انھیں کے خیال کے مطابق قید خانے سے رہائی معلوم ۔ دلی سے
رامپور جاتے ہیں تب بھی خیال شاگردوں کی استانی اور بچوں کی دادی
کی طرف لگا رہتا ہے۔ مکان لیتے ہیں تو محل سرا کی قربت چاہتے
ہیں۔ ان کی ساری ظرافت اصل میں دل کو خوش کرنے اور غم کو چند
لمحے بھول جانے کا بہانہ ہے"[۱]

غالب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی نظر ہر رنگ میں وا ہو جانا چاہتی تھی اور اسے "جلوۂ صد رنگ" کا لپکا تھا[۲] تو ایک غالب ہی پر کیا منحصر اس دور کی تہذیب میں کون اس سے بچ سکا تھا۔ مولوی فضل حق خیرآبادی ایک روایت کے مطابق بہ ہمہ عالمانہ تشرف و بزرگی اس کوچہ سے نابلد نہیں تھے۔ خود ان کے مکان میں ایک بار ان ہی کی موجودگی پر غالب کو لقمہ دینا پڑا تھا کہ "بیا برادر کے ساتھ ہمنشیں مادر بھی کہہ ڈالئے"[۳] اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کی تہذیب نے اسے روا رکھا تھا اور غالب کی بیوی امراؤ بیگم اسی تہذیب کی تربیت یافتہ تھیں۔

حالی کی یادگار میں یہ تذکرہ صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ امراؤ بیگم نے شوہر کی مئے نوشی کے سبب برتن الگ کر لئے تھے لیکن یہ امر ان کی تاہلی زندگی کی تلخی کا سبب نہیں بن سکا اور نہ حالی نے کہیں اس تعلق سے ہلکا سا اشارہ ہی کیا ہے۔ ہر مہذب مرد خواہ کتنا ہی بے راہ رو ہو اس کو اپنی بیوی کی نیکی اور پارسائی کی ہر بات عزیز ہوگی غالب کے بھی اس بات پر ناراض ہونے یا کبیدہ خاطر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

---

[۱] ڈاکٹر زینت ساجدہ۔ غالب اپنے خطوط کے آئینے میں "سب رس" صفحہ ۱۵
[۲] ڈاکٹر ظ۔ انصاری مضمون "غالب کی کہانی" رسالہ شاعر۔ غالب نمبر ص ۲۷
[۳] محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ماخوذ۔ صفحہ ۵۲۸

جب کہ وہ خود تقویٰ اور پرہیزگاری کے معاملہ میں ازحد حساس تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو تذکرۂ غوثیہ میں غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے ملفوظات میں ملتا ہے۔ صوفی منش غالب صحبتِ اہلِ صفا کے قائل تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ شاہ صاحب دلی کی زینت المساجد میں قیام پذیر ہیں تو وہ ہر دوسرے تیسرے روز ان کے لئے کھانے کا خوان ساتھ لے جاتے تھے لیکن خود کبھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتے۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ ہر تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے میں اس قابل نہیں ہوں۔ میخوار رو سیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اُلش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا[۱]۔"

غالب کے اس رویہ کی روشنی میں نظریہ نظرِ ثانی کا محتاج قرار پائے گا کہ امراؤ بیگم کا تقویٰ غالب کی تاہلی زندگی میں رنجش کا باعث رہا ہے۔

اہلِ خاندان سے غالب کی وابستگی کا اندازہ اس مرثیے سے بھی ہو سکتا ہے جو انھوں نے جواں سال عارف کی موت پر کہا تھا۔ عارف کی دائمی مفارقت غالب کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی اگر اس کے دونوں لڑکے مرزا باقر علی اور حسین علی خاں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان نہ بن جاتے۔ غالب کو ان بچوں سے جو والہانہ محبت تھی اس کے مد نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص کا تاہلی زندگی سے برگشتہ یا بیزار ہونا محال ہے یوں بظاہر غالب ایک لاابالی شاعر معلوم ہوتے تھے لیکن فطرتاً وہ بڑے ذمہ دار انسان تھے۔

---

[۱] گل حسن: تذکرہ غوثیہ صفحہ (۱۰۵) مطبوعہ ۱۹۶۵ء

انھیں گھر کی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں اور بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی خواہشوں اور فرمائشوں کا خیال سفر و حضر ہر حال میں رہا کرتا تھا[1] ایک مکتوب کا اقتباس ملاحظہ ہو جس کے مخاطب اگرچہ مرزا شہاب الدین احمد خاں ہیں لیکن در پردہ مقصد احوالِ سفر بچوں کی دادی کو سنانا ہے۔

"چار گھڑی دن رہے ہیں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دئے۔ رات ہو گئی۔ شراب پی لی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ادہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائے اور سب آدمیوں کو بھی کھلائے۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا ترکاری نہ ڈلوائی بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں اتنی بات زاید ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے دونوں بھائی مل کر کھالیتے ہیں۔۔۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا"[2]

---

[1] مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ۔ مکتوب بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں صفحہ (۲۸۶)

[2] "احوالِ غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بعض مضامین سے غالب کے درون خانہ ہنگاموں کا اندازہ ہوتا ہے۔ معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم ضیا الدین احمد خاں نیر کی بیٹی جو عارف کے بڑے لڑکے باقر علی خاں سے بیاہی گئی تھیں، غالب کی زندہ دلی کے واقعات سناتے ہوئے کہتی ہیں کہ امراؤ بیگم سے غالب کی دلچسپ اور پر لطف نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ ذیل کے اقتباس میں ایک خوشگوار خاندانی ماحول کی تصویر ملتی ہے۔
"برسات کے دن تھے۔ مینہ برسنے لگا۔ پوتوں نے کھانا کھایا (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

اپنی عمر کے آخری ایام میں بھی غالب کو اپنی گرہستی اور خاندانی زندگی متاعِ عزیز سے کم نہ تھی اس کا ثبوت اس پُراثر واقعہ میں ملتا ہے جو ان کی عمر کے آخری لمحات میں پیش آیا حسن کو حمیدہ سلطان نے بگا بیگم کے حوالے سے اس طرح بیان کیا ہے ۔

"جندو بیگم، بگا بیگم کی بیٹی اور غالب کی لاڈلی پوتی تھی جس سے انھیں بڑا پیار تھا اور جسے وہ لاڈ سے جیون بیگ کہا کرتے تھے ۔ مرنے سے چند لمحے پہلے اسے بلا بھیجا، معلوم ہوا کہ وہ سو رہی ہے تو کہا کہ اچھا جب وہ آئے گی تو کھانا کھاؤں گا یہ کہہ کر لیٹ گئے اور بے ہوش ہوگئے ۔ عالم سکرات مرزا صاحب پر کئی گھنٹے طاری رہا حکیم محمود خاں نے کہا ان کی جان کسی چیز میں اٹکی ہوئی ہے ۔ سب لوگوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ جندو بیگم میں مرزا صاحب کی جان اٹکی ہے ۔ حکیم محمود خاں نے ہدایت کی کہ جس طرح وہ ہمیشہ آتی ہیں اسی طرح آنے دو ۔ چنانچہ جندو بیگم کو مرزا صاحب کے پاس چھوڑا تو انہوں نے حسبِ معمول ان کے سینے پر سر رکھ کر منہ کان کے قریب لے جا کر آواز

(باقی سلسلہ ۱۱۰ صفحہ سے) اور چلے گئے نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے بیوی سے باتیں کر رہے تھے ۔ میں یوں بیٹھی تھی ۔ گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی کہنے لگے : ایک بیوی دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ۔ بہو میں اور میری بیوی بیٹھے میں تم کیوں بیٹھی ہو؟ اس پر میری ساس بولیں ۔ اے توبہ بڈھا تو دیوانہ ہے اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے اب بہو ہی مل گئی ۔ میں تنے میں اٹھ کر کونے میں جا چھپی ۔ ۔ ۔"

پروفیسر حمید الدین خاں مضمون غالب کی زندگی ایک جھلک " صفحہ (۸۵) مطبوعہ ۱۹۵۳ء

لگائی داداجان اور مرزا نے فوراً آنکھ کھول کر اپنی لاڈلی پوتی کو دیکھا اور جاں، جاں آفرین کو سپرد کی" ؎۱

اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کی موت کے بعد ان کی بیوی کی کفالت کا بار کون سنبھالے گا۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رامپور کو وہ مکتوب لکھا تھا جو آج بعض اصحابِ قلم کی نظر میں غالب کی شخصیت کا ایک معیوب پہلو سمجھا جا رہا ہے ؎۲ اس خط میں غالب نے نواب رامپور سے یہ آخری درخواست کی تھی کہ مفتی صدرالدین آزردہ کی بیوہ کے مقابلے میں میری بیوی آپ کی اعانت اور امداد کی زیادہ مستحق ہے۔ اس لئے کہ آزردہ کی اہلیہ کے یہاں گزر بسر کے لئے کچھ تو وسائل ہیں جبکہ میرے مرنے پر میری بیوی بالکل بے سہارا ہو گی جس کی معاش کا کوئی وسیلہ نہیں۔ غالب کی اس درخواست کے سبب آج ان پر خود غرضی اور بے مروتی کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں ؎۳ لیکن اپنی زندگی کے تقاضوں کے مدنظر غالب کے اس اقدام کو ان کے احساس ذمہ داری پر محمول کیا جا سکتا ہے جو انسانیت کی احسن قدروں میں سے ایک اہم قدر ہے۔ غالب پر کی جانے والی عصر حاضر کی تنقیدات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا۔

> "ان مجلدات میں جو مضامین درج ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ غالب سے متعلق جو باتیں جس طرح سے مان لی گئی تھیں ان میں سے اکثر صحیح نہ تھیں یا ان کا مدار واقعیت پر اتنا نہ تھا جتنا عقیدت پر۔ کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوں گی جن سے غالب کی شخصیت جہاں تہاں سے دھندلی یا داغدار نظر آئے گی لیکن

؎۱ حمیدہ سلطان۔ مضمون مرزا باقر علی کامل احوالِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد صفحہ (۲۸۳)

؎۲،۳ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ ماخوذ صفحہ (۹۹۔۱۰۰)

ان کے باوجود غالب، غالب ہی رہتے ہیں یعنی عہد بھی اور عہد آفریں
بھی۔ غالب کی تمام کمزوریاں بھی صحیح مان لی جائیں تب بھی ان کی
اہمیت و عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔"[۱]

غالب شناسی کی پوری ایک صدی اسی تگ و دو میں گزر گئی کہ غالب کیا تھے ہر ایک نے اپنے مخصوص دائرے میں غالب کی دریافت اور بازیافت کی کوشش کی ہے لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ ساری تگ و دو خود غالب کی نظر میں صرف اتنی ہے ؎

رہرو تفتہ و رفتہ بہ آبم غالب
تو شتۂ برلب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا پانی کو دیکھ کر بے اختیار اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے اور ندی کے کنارے پر اس کا زادراہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں بقول حالی۔

"مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے گویا
یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھ کو محض اٹکل اور قرائن سے
پہچانا ہے ورنہ میں جیسا کہ ہوں سب کی نظر سے مخفی رہا ہوں[۲]

غالب کی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے دیدہ ور پوری دلّی کی تصویر دیکھ لیتا ہے اور بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ انیسویں صدی کی وہ دلّی، وہ تہذیب اور وہ پورا عہد غالب کی موت پر تمام ہوا ۲/ذی قعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء کو غالب نے تہتر برس، چار ماہ کی عمر میں وفات پائی اور دلّی کی تہذیب و ثقافت کا یہ گنج مخفی درگاہ سلطان نظام الدین اولیاء کے احاطہ

---

[۱] رشید احمد صدیقی۔ مضمون غالب اور علی گڑھ صفحہ ۱۳

[۲] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب حصہ دوم صفحہ ۲۰۷

میں مدفون ہے۔[1] اس رہرو تفتہ کا زاد راہ وہ علمی و ادبی سرمایہ ہے جو کلیات فارسی، دیوان اردو اور مکتوبات اردو کی صورت میں ہم تک پہنچا اور حالی کے الفاظ میں یہی غالب کی زندگی کا مہتم بالشان کارنامہ ہے۔

آنے والے دور کے ذہنی میلانات اور تنقیدی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے حالی نے کوئی پون صدی پہلے ہی یہ اعلان کر کے بڑی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے کہ

> "اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے"[2]

حالی نے یہ احساس بھی دلانے کی کوشش کی ہے کہ ایک زوال رسیدہ پژمردہ دل مردہ سوسائٹی کے حق میں غالب کا کلام اور ان کے نوادرات ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھے۔

---

[1] شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ ماخوذ صفحہ ۱۸۷

[2] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ دیباچہ صفحہ ۴

۹

نظم و نثرِ فارسی

"فارسی بیں گر بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ"

غالب کی علمی و ادبی تصانیف کی اجمالی فہرست محمد حسین آزاد کے تذکرۂ آبِ حیات میں ملتی ہے [۱] حالی نے یادگار میں کوئی مرتب فہرست دینے کے بجائے مختلف اصنافِ شعری میں غالب کی طبع آزمائی اور نثر فارسی و اردو میں ان کی طرزِ انشا پر ریویو، تبصرہ اور تنقید سے سروکار رکھا ہے۔ بعد کے تاریخ اور تذکرہ نگاروں میں رام بابو سکسینہ اور مالک رام کے نام قابلِ ذکر ہیں کہ انہوں نے تصنیفاتِ غالب سے قدرے تفصیل کے ساتھ متعارف کروایا ہے [۲] شیخ محمد اکرام نے غالب کے تخلیقی کارناموں کو سوانحی حالات کے پس منظر میں جانچنے کی کوشش کی ہے مگر ایک مرتب فہرست کی کمی اس تصنیف میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ زمانۂ حال تک کی تحقیق کے مطابق غالب کی شعری اور نثری تخلیقات حسبِ ذیل تصانیف پر مشتمل ہیں۔

گلِ رعنا، میخانۂ آرزو سرانجام، پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو
قاطعِ برہان، درفشِ کاویانی، تیغِ تیز، نامۂ غالب، لطائفِ غیبی،
سبدِ چین، باغِ دودر، دیوانِ غالب اردو، عودِ ہندی، اردوئے معلیٰ، اور
متفرقات میں مکاتیبِ غالب، نکاتِ غالب اور

---

[۱] محمد حسین آزاد، تذکرہ آبِ حیات صفحہ (۵۲۰)
[۲] رام بابو سکسینہ، تاریخ اردو ادب صفحہ ۳۲۸، ۳۲۹

قادر نامہ وغیرہ[1]

اس ادبی ورثے میں فارسی کے مقابلے میں ان کا اردو کلام ہی زیادہ تر مرکز توجہ بنا ہوا ہے اس لئے کہ فارسی کا چلن تو حالی کے عہد سے ہی اٹھتا جا رہا تھا اور اس کی جگہ اردو علمی و ادبی زبان کا مقام حاصل کر رہی تھی۔ عصر حاضر کے غالب شناسوں پر حالی کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ فارسی نظم و نثر میں غالب کے ان افکار عالیہ سے جو ظسفہ، تصوف، حکمت، منطق، عشق و عقل، زہد و رندی، دنیا و عقبیٰ، انسان اور کائنات سب ہی پر محیط ہیں، آنے والے زمانے کے ارباب ذوق کو روشناس کروایا۔ عصر حاضر کے محققین فی الوقت ان کے اردو کلام کی ہی گتھیوں کو سلجھانے میں سرگرداں ہیں غالب کی نظم فارسی پر تحقیقی کام ہنوز جاری ہے اس سمت میں حالی کے بعد جو پیش رفت ہوئی ہے وہ فی الوقت تشریحات و تراجم کے دور سے گزر رہی ہے اور جب تک غالب کے اردو دیوان کی طرح ان کے فارسی کلام سے بھی کلی طور پر آگہی نہ حاصل کی جائے تب تک یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہے کہ مغلیہ تہذیب نے غالب کی صورت میں زمانے کو کیا دیا اور غالب نے اپنے افکار عالیہ سے نہ صرف اپنے عہد کو بلکہ آنے والے ادوار کو کس پایہ کا انداز فکر بخشا۔

غالب جیسے حوصلہ مند شاعر کی تنوع پسند طبیعت کا تقاضہ تھا کہ وہ غزل قصیدہ، مثنوی ہر صنف شعر میں اپنی سخنوری کا ثبوت بہم پہنچائے۔ دوسرے وہ فارسی بیں گر بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" کا دعوی بھی اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ زمانے سے اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوائیں اور اس مقصد کے لئے غالب نے بڑی جگر کاوی سے اپنے فارسی کلام کو تب و تاب بخشی ہے۔ کلیات فارسی میں غزل قصیدہ اور مثنویوں کے علاوہ رباعیات، قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں اور حالی کی نظر میں غالب کے قصائد بہ اعتبار کمیت

---

[1] مالک رام۔ ذکر غالب۔ صفحہ ۱۷۹

اور بلحاظ کیفیت ان کے دیگر اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔

غالب نے تمام اصناف شعر میں قصیدہ کو محض اہل جاہ کی مجلسی کی خاطر نہیں اپنایا تھا بلکہ اس عہد کی تہذیب میں وہی شاعر مسلم الثبوت مانا جاتا تھا جو قصیدہ گوئی میں اپنی مہارت بہم پہنچائے۔

قصیدے کی طرح فارسی غزل میں بھی غالب اساتذہ ایران سے متاثر رہے ہیں۔ غالب نے تو نظیری کی روش پہ چلنے کا دعویٰ کیا تھا مگر حالی کے خیال میں۔

"ان کی غزل میں نہ صرف نظیری بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی" [۱]

کلیات فارسی میں رباعیات قریب سوا سو کے ہیں اور حالی کی رائے کے مطابق۔

"مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے" [۲]

غالب نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی تاہم ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں شامل ہیں۔ مثنوی باد مخالف اور مثنوی چراغ دیر سفر کلکتہ کی یادگاریں ہیں۔ مثنوی ابر گہر بار غالب کی ایک ناتمام لیکن معرکہ کی مثنوی ہے [۳]

---

[۱] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب حصہ دوم صفحہ ۱۰۴

[۲] " " صفحہ ۲۸۶

[۳] " " ماخوذ صفحہ (۳۰۷)

خود غالب نے ایک مکتوب میں اس مثنوی کے تعلق سے اپنے تاثرات حسب ذیل الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

"ایام شباب میں کہ بحر طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیئے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستاں طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ نو سو شعر کو چھپوا یا" [۱]

بقول حالی مرزا کو مثنوی پر بھی تقریباً ایسی ہی قدرت ہے جیسی قصیدے اور مرثیے پر [۲] غالب کی نظم فارسی کے جائزے میں مرثیہ نگاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صنفِ مرثیہ کے باب میں حالی نے غالب کے ایک مرثیہ کا ذکر کیا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے جواں سال بیٹے فرخندہ شاہ کی موت پر کہا گیا تھا [۳]

غالب نے اگر نعت رسول اکرم صلعم اور منقبت اہل بیت اطہار کا سرمایہ یادگار نہ چھوڑا ہوتا تو ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا۔ ان کی کلیات فارسی میں وہ قصائد بھی معرکے کے ہیں جو حمد، نعت، منقبت اہل بیت کے طور پر کہے گئے ہیں۔ اگر ہندوستان میں فارسی ادب کا رواج عام حسب سابق برقرار رہتا تو لوگ جانتے کہ غالب کا نعتیہ کلام کس مرتبے کا ہے پھر بھی غالب کی اس نعت کو جس کا مطلع ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہے اور اس کو نعتیہ ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے

---

[۱] نثار احمد فاروقی۔ مضمون مرزا اسد اللہ خاں غالب رسالہ نقوش آپ بیتی نمبر۔ مرتبہ طفیل احمد صفحہ ۷۸۴) [۲] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب ماخوذ صفحہ (۳۳۷) [۳] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب ماخوذ صفحہ (۲۳۰)

غالب کو فارسی ادب کا سب سے اہم عقلیت پسند شاعر کہا جاتا ہے اس لئے کہ غالب فکر اور فن کے معاملہ میں کورانہ تقلید کی بجائے آزادیٔ فکر کے علمبردار رہے ہیں۔ فارسی کے نظم و نثر میں غالب کا فارسی کلام خصوصیت کے ساتھ زیادہ بے باک اور شوخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بار بار اس قسم کا اعلان کر کے کہ ؎

بامن میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگان خوش نکرد

نہ صرف اپنے لئے ذہنی آزادی کا حق طلب کر لیا ہے بلکہ اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی اس سے کشادہ تر، وسیع تر اور آزاد تر ذہنی فضا تیار کر دی جتنی فارسی علم و ادب کے ورثے نے شاعر کو بخشی تھی۔

غالب کی نثر فارسی مقدار میں نظم فارسی سے کہیں زیادہ ہے۔ پنج آہنگ کے پانچ رسالے اور مہر نیم روز تو غالب کی وہ نثری تخلیقات ہیں جس میں انہوں نے انشا پردازی کے جوہر خصوصیت کے ساتھ دکھلائے ہیں اور فارسی کی انشائیہ ادب میں انکی اہمیت مسلمہ ہے۔

اردو و فارسی ادب کے ممتاز محقق ادیب اور بالغ نظر محقق، قاضی عبدالودود کی تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں قاطع برہان اور اس کے متعلقہ رسائل سوالات عبدالکریم، لطائف غیبی، نامہ غالب، اور تیغ تیز کا مجموعہ پہلی بار ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کے زیر اہتمام صد سالہ اشاعت کلیات غالب کے عنوان سے شائع ہوا[1]۔

---

[1] مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام کلیات غالب فارسی جلد اول، دوم، سوم مرتبہ مرتضیٰ حسین خان فاضل لکھنوی اور مجموعہ نثر غالب" مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی بھی غالبیات میں قابلِ قدر اضافے ہیں" مجموعہ نثر غالب میں رسائل غالب کے علاوہ دیباچے، تقریظ مضامین اور متفرق نثر پاروں کو بڑی تحقیق سے یکجا کر دیا گیا ہے مطبوعات مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۔ ۱۹۶۷ء

حالی کی میزانِ تنقید میں متاخرین فارسی کے مقابلے میں غالب کا پلّہ بھاری ہے۔ ذیل کا اقتباس حالی کی رائے کا عطر ہے۔

"الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحاصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا ہے۔ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے"[1]

غالب کے ایک شاگرد رشید ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے بڑے بلیغ انداز میں کہا تھا۔

"ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتداء ایک ترکِ لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترکِ ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا"[2]

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالیؔ یادگارِ غالب حصہ دوم صفحہ ۴۳۷

[2] خواجہ الطاف حسین حالیؔ یادگارِ غالب حصہ دوم صفحہ (۲۰۱)

(۱۰)

دیوانِ اُردو

"وہ جو کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی"

غالب کے فارسی کلام کے مقابلے میں ان کا اردو دیوان اگرچہ ایک دیوان چہ ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے فارسی کا ہم پلہ ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود اردو کے کلاسیکی ادب کا منتخب دیوان مانا جاتا ہے جو اپنے اچھوتے انداز بیان اور فلسفیانہ افکار کی بنا پر گذشتہ پون صدی سے اصحاب نقد ونظر کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ کسی بھی شاعر کی قدر محض اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ ایک ضخیم شعری سرمایہ کا مالک ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کلام کس پایہ کا ہے دیوان غالب کے بلند پایہ ہونے کی دلیل یہی ہے کہ غالب اسی دیوان کی بدولت نہ صرف اردو کے منفرد اور بے مثل شاعر تسلیم کئے گئے بلکہ آج ان کا کلام عالمی ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور ان کا نام کالیداس، گوئٹے، فردوسی اور شیکسپیر جیسے عظیم شاعروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

غالب اپنی شخصیت اور فن دونوں کی نشوونما اور فروغ میں انفرادیت کے قائل تھے۔ ان کی شریعت میں تقلید کی گنجائش کم ہی تھی۔ شارع عام پر چلنا ان کے لئے باعث ننگ تھا جس طرح وہ اپنی طرز معاشرت لباس، وضع قطع میں روش خاص کے پابند تھے اسی طرح شعر گوئی کے معاملہ میں بھی ان کے تخیل اور فکر نے انفرادیت کی شان کو برقرار رکھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے تخلص غالب پر بھی نازاں تھے کہ شہر دلی میں کوئی ان کا ہم تخلص نہیں، مکتوبات میں بھی ان کی اسی افتاد طبع کا پرتو ملتا ہے۔

مولانا حالی کے تجزیہ کے مطابق ایک طرف تو شاعری کا ملکہ جو مبداء فیاض سے بخشا گیا، خدا داد ذہانت، ان کا وسیع مطالعہ، زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت، غلوئے تخیل،

نکر رسا، دقتِ نظر، طرفگیِ خیال، جدت ادا اور شوخیِ بیان، دوسرے ان کے مشاہدات اور ذاتی تجربات پھر فلسفیانہ افکار کی فراوانی، صنعت شعر کی معنی آفرینی، مضامین نو دست بستہ حاضر، ان سب پر مستزاد غالب کا ترکانہ و حریفانہ لب و لہجہ جس کے لئے نہ میر کی زبان متحمل ہو سکتی تھی اور نہ ذوق و ظفر کے روزمرہ و محاورے سے ہی کام آسکتے تھے غالب نے غزل کے لب و لہجہ کو بدلا دوسرے متنوع مضامین اور فلسفیانہ موضوعات سے اردو غزل کے میدان کو وسیع کیا۔ عصر حاضر کے نقاد یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ۔

"اس نے لب و لہجہ میں، الفاظ و تراکیب کے خزانے میں، استعاروں میں عمارت کی اندرونی سجاوٹ میں اتنے بہت نقش دے دیئے جو آج تک اردو کے کسی ایک شاعر نے تن تنہا نہیں دئے۔ گویا غالب کے وسیلے سے فارسی شاعری کے ہزار سالہ گلستانوں کا رس اردو ادب کو میسر آیا ہے" [1]

فارسی آمیز تراکیب اردو غزل میں برتنے کا جو تجربہ غالب کر رہے تھے وہ ذوق اور ظفر کے شیدائیوں کے لئے ناقابل قبول تھا۔ اردو غزل کے تعلق سے غالب کا یہ رویہ ان کی نظر میں عیب تھا مگر حالی وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے منصفانہ انداز میں غالب کے اس شعوری عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی غالب کے فن کا ہنر ہے۔

زبان کے معاملہ میں غالب کے اس اجتہادی طرز عمل کے نتیجے میں اردو غزل جہاں روزمرہ اور محاوروں کی پابندی سے آزاد ہوئی وہیں فلسفیانہ افکار کے لئے اردو زبان میں فارسی الفاظ کے ذخیرے کا اضافہ ہوا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اسے غالب کا مستحسن اقدام قرار دیا ہے [2]

۱؎ ظ۔ انصاری مضمون غالب کی فارسی شاعری کے اہم نکتے "غالب نما" مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص ۲۶۲

۲؎ عبدالرحمٰن بجنوری محاسن کلام غالب۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱

ایک ایسے دور میں جبکہ تمام شاعر استعارے کو روایتاً باندھتے تھے غالب نے استعارے کو ایک پوری کیفیت کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔ غالب نے تشبیہ اور استعارے کے علاوہ کنایہ و تمثیل سے بھی بہت کام لیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام پہلودار ہوگیا ہے۔ غالب نے فارسی الفاظ اور تراکیب کو اس ہنر مندی سے برتا ہے کہ باوجود اشکال کے آج ہماری زبانوں پر رواں ہیں۔ ترکیبات کے نگینے تراشنا، تشبیہات و استعارات وضع کرنا وہ خوب جانتے ہیں اس طرح خیال و فکر میں بھی وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں اور ان کی آواز سخنوروں کی بزم میں صاف پہچانی جاتی ہے۔

وہی گائک نئے راگ ایجاد کر سکتا ہے جو موسیقی کے موجود سرمایہ پر حاوی ہو اس کی سب سے اچھی مثال امیر خسرو ہیں۔ اچھا فن کار وہی ہے جو خود راہ کے روڑے چن لیتا ہے اور منزل پر تازہ دم پہنچتا ہے اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے راہ کی صعوبتیں جھیلی نہیں۔ جنھیں صرف عطر سے واسطہ ہے ان کی نظر سے جہدِ عطار اوجھل رہتی ہے۔ غالب نے اپنی اس سعی سے متعلق ایک فارسی شعر میں اشارہ بھی کیا ہے ؎

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہ رواں ست مرا[1]

دبستان کے بعد غالب کا دوسرا بڑا احسان تنگنائے غزل کو وسعت بخشنا ہے متنوع مضامین اور معنی آفرینی نے اردو غزل کی رعنائی کو دوچند کر دیا اور ریختہ گوئی کی تاریخ میں غالب کا یہ اجتہاد ایک معرکہ آرائی سے کم نہ تھا۔

ظفر کے زمانے میں عارضی طور پر سہی امن و امان کے ماحول نے علوم و فنون کی سرگرمیوں کو از سر نو جاری کر دیا تھا۔ اسی حالت کو ادب میں دلّی کا سنبھالا کہا گیا ہے یعنی حالات نہ ایسے ناگفتہ بہ تھے کہ غالب کو شہر آشوب لکھنے کی ضرورت ہوتی اور نہ ہی ایسی خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا کہ ابوالفضل کی طرح آئینِ اکبری

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب حصہ دوم صفحہ (۲۰۷)

کی طرز پر غالب کوئی آئین ظفر یا ظفر نامہ لکھتے۔ اس عہد کی دلّی، تاریخ کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایسے میں ماضی سے استواری، حال سے آگہی اور مستقبل کی بصیرت کے لئے غیر معمولی ذہانت شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اور فطرت کی طرف سے یہ نعمتیں غالب کو وافر انداز میں ودیعت کی گئی تھیں۔ سفر کلکتہ نے ان کے قوت مشاہدے کو بھی تیز تر کر دیا تھا۔ اس لئے غالب کا شعور جو جاگیردارانہ ہونے کے باوجود بدل رہا تھا کلکتہ اور دلی کے امتیازات اور فرق کو محسوس کر رہا تھا۔ اردو غزل کا غالب غیر معمولی ذہین، باشعور اور حساس ہے اس کی دراکی اور جودت طبع "اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو" کا حوصلہ بخشتی ہے۔ وہ چاہتے تھے مغرب کے سائنسی علوم کی برکتوں سے آگہی حاصل کی جائے۔ اس وقت کتنے شاعر تھے جو اسٹیم، انجن، ٹیلی فون، ریلوے اور بجلی کے نام بھی جانتے ہوں ان کی افادیت کا احساس تو بڑی چیز ہے اور غالب کی بصیرت اور ترقی پسندانہ ذہن کی دلیل یہی ہے کہ انہوں نے اس نظام کو سراہا جو سائنس کی برکتوں سے زندگی کو مالامال کر سکتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین۔

> "مغرب سے آئے ہوئے نظام کے ان پہلوؤں کو سراہنا جو ترقی پسندانہ تھے اس زمانے میں حیرت خیز آزاد طبعی اور جرأت آفرینی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔" [۱]

یہ ہندوستان کی تاریخ کا المیہ ہے کہ ہندوستان کا ذہین سے ذہین مفکر اس تخلیقی گرمی سے خالی تھا جو قوموں کی تقدیر بدل دیتی ہے اور اپنے اندر اجتماعی روح کی پرورش کرتی ہے غالب نے عملی زندگی کی جگہ فکری زندگی میں آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی کے اندر انسان، کائنات، فنا بقا اور تمنائے مرگ، کثافت و لطافت، روایت اور بغاوت جبر و اختیار، عبادت اور ریاکاری غرض کہ ایسے تمام مسائل پر جدت طرازی کے ساتھ اظہار خیال کیا جو ایک متجسس ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ متصوفانہ خیالات میں بھی غالب نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

---

[۱] پروفیسر سید احتشام حسین مضمون "غالب کا آغاز" مجموعہ مضامین "تنقید اور عملی تنقید" ص ۶۷

حالی کی نظر میں غالب کی سب سے اہم اور مقدم خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ ایک وہبی شاعر تھے۔ اکتسابی شاعر لاکھ باکمال سہی لیکن اس کا شعر قرین الہام نہیں ہو سکتا، نہ صریرِ خامہ نوائے سروش، جب تک شعر گوئی اس کی فطرت میں ودیعت نہ ہو۔ خود غالب نے نزولِ شعر کے تعلق سے کہا تھا۔

"صناعتِ شعر اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہئے، دماغ چاہئے ذوق چاہئے، امنگ چاہئے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر ولولۂ شباب کہاں۔ رعایتِ فن اس کا کیا کہاں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"[1]

اردو غزل کو غالب کی اہم ترین دین ان کا نظریۂ فن ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔" یہ نظریہ دراصل اس عہد کے شعری روایتوں سے محض انحراف نہیں بلکہ نئے راستوں کی دریافت کے لئے مشعل برداری کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ غالب کا یہ مخصوص نظریہ جو بڑے دوررس اور دیرپا نتائج کا حامل تھا فنِ غزل گوئی کے حق میں انقلاب آفرین ثابت ہوا۔

غالب نے یوں تو فارسی میں تمام اصناف شعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو میں انہوں نے صرف صنف غزل کو اپنایا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مغلوں کا ذوقِ لطیف جو کبھی فنون لطیفہ کے تمام شعبوں پر محیط تھا مغل دور آخر میں سمٹ کر فن غزل گوئی پر تمام تر مرکوز ہو گیا تھا۔ اور یہ محض حسن اتفاق نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغلیہ سلطنت جب روبہ زوال تھی تو اردو شاعری اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہی تھی سخنوری اور سخن سنجی دلی کی تہذیب کا جزو بن گئی تھی۔ دلی کے بچے بچے کو شعر سے شغف تھا۔ رع ہے ہوا میں شراب کی تاثیر کے مصداق ان دنوں دلی کی فضائیں شعر کی تاثیر سے لبریز تھیں۔ اردو شاعری کے کائنات پر سودا اور میر آفتاب

---

[1] مرزا غالب۔ اردوئے معلی۔ مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ صفحہ ۱۳۱

اور جہتاب بن کر ابھرے تھے۔ ان کے بعد تابناک ستاروں کا جھرمٹ غالب، مومن، شیفتہ، ذوق اور ظفر کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس طرح قصیدہ عرب کا مثنوی عجم کا مزاج تھا اسی طرح غزل اردو زبان کا مزاج بن گئی۔ اردو شاعری غزل سے عبارت ہے۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں ــــ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔" اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا دیوانِ اردو اس آبرو کی ضمانت ہے۔

قدیم غزل کی وہ روایت جس کا آغاز امیر خسرو سے ہوا تھا، انداز فکر اور اسلوب بیان کی کئی منزلیں طے کرتی ہوئی غالب تک پہنچی تھی۔ غالب نے اپنی فنی اور فکری بصیرت سے اس کو جہان نئی جہتوں سے روشناس کیا وہیں اس کو نیا رنگ و آہنگ اور سوز و ساز دے کر اس انتہائے کمال پر پہنچا یا کہ صنف غزل کو اس سے آگے لے جانا بڑے سے بڑے فن کار سے بھی ممکن نہ ہو سکا۔ غالب کے بعد اردو کو حالی، اقبال اور فیض جیسے باکمال شاعر ملے لیکن غزل گوئی میں غالب کا تتبع کسی سے نہ ہو سکا۔ البتہ غالب کی فن کارانہ بصیرت کی روشنی میں انھیں اپنی راہیں متعین کرنے میں مدد ملی۔ حالی نے شاعری میں اصلاح و افادیت کے رجحان کو اپنایا اور اقبال نے فلسفہ و فکر کی راہ اختیار کی اور دونوں نے غزل کی بجائے نظم کے پیمانے کو برتا۔ اس طرح تغزل کا حسن جو رمز و کنایہ، اشارت، عبارت اور ادا میں مضمر تھا، غالب پر تمام ہوا۔ غزل کے ایجاز کی جگہ نظم کی اطناب نے لے لی۔ یہی وجہ ہے کہ جو بات ہمیں غالب کے یہاں صرف ایک شعر کے دو مصرعوں میں ملتی ہے وہ حالی اور اقبال کے یہاں پوری نظم میں ملے گی۔

غالب نے تصورِ حیات، فلسفہ، غم، نظریہ عشق اور انسان کے منصب و مقام جیسے وسیع موضوعات کو غزل کے پیمانے میں اس انداز سے باندھا ہے کہ غزل کا رنگ تغزل اور نکھر آیا۔

پروفیسر محمد مجیب نے کلام غالب کے موضوعات کا جائزہ لیتے ہوئے اس انسان کی نشاندہی کی جو غالب کے تخیل کی تخلیق اور ان کے کلام کا خالق ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ یہی غالب کا سب سے اعلیٰ شاعرانہ استعارہ ہے۔ ذیل کا اقتباس اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں خود غالب کی شخصیت جھلکتی ہے۔

"غالب نے انسان کو دریافت نہیں کیا۔ شاعر کا منصب یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نظر میں وہ قوت پیدا کرے جس سے وہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو ہر پہلو سے دیکھ سکے۔ غالب نے اس منصب کا حق ادا کیا، شوق کو جو انسانیت کا جوہر ہے، عالمِ وجود کی سیر کرنا سکھایا اور اسے ہمت دلائی کہ مسکرا کر یا خفا ہو کر زندگی کی ایسی تمام شرطوں کو نامنظور کرے جن سے اس کی آزادی محدود ہوتی ہو یا اس کے مرتبۂ انسانی میں کمی پیدا ہوتی ہو"[۱]

غالب کے تصورِ حیات میں ان کی فطری ترک تازی جھلکتی ہے جو ان کے عہد کے تقاضوں کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے اسی لئے ان کی شاعری کو حریفانہ اور ترکانہ کہا جاتا ہے۔ غالب کے فن سے بحث کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں۔

"وہ شاعری میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے خود اتنے قائل نہ تھے جتنے اپنے تجربات بیان کرنے یا فیصلہ کرنے میں جری تھے اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا خود شاعری کی گرفت میں ہو"[۲]

---

[۱] پروفیسر محمد مجیب۔ غالب۔ اردو کلام کا انتخاب صفحہ ۳۹ مطبوعہ ۱۹۶۹ء

[۲] پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مضمون "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" نقدِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۳۲۷

غالب کا تصوّرِ حیات، تصوّرِ غم کے بغیر ادھورا اور نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ غالب کو بھی غمِ ذات اور غمِ زمانہ سے واسطہ رہا ہے۔ درد و غم کے شدید سے شدید احساس کے باوجود غالب مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے۔ غالب کے تصوّرِ غم کا اندازہ سن ستاون کے "رستخیزِ بے جا" کے پس منظر میں لگایا جا سکتا ہے۔ دلی کی تاریخ کا یہ پُر آشوب دور بھی غالب کے بلند حوصلوں کو متاثر نہیں کر سکا۔ غدر کی خوں آشامیوں کو اسی اطمینانِ قلب کے ساتھ انگیز کرتے رہے جیسے یہ بھی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل ہی ہے۔ انہوں نے دلّی کی تباہی پر نہ تو کوئی مرثیہ کہا اور نہ شہر آشوب [1] غالباً وہ اس کو اپنے سپاہیانہ وقار کے منافی سمجھتے ہوں۔ اردو دیوان

---

[1] (دلّی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام) "مشاعرہ ہوا نامی گرامی شعرا نے دلّی کی تباہی اور بربادی پر نظمیں لکھیں تھیں اور بڑے سوز و گداز سے سنا رہے تھے پورا مجمع ساکت تھا اہلِ مشاعرہ پر افسردگی کا عالم طاری تھا' دلّی کی تباہی دوستوں، عزیزوں کے بچھڑ جانے کا خیال دل خون کیے دیتا تھا۔ یکایک غالب نے شاداں کی جانب نظر اٹھائی، مجمع کی آنکھیں اسی نورِ نظر پر لگ گئیں۔ شاداں نے صاف اور پیاری آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

خوب ہوا مٹ گیا جو نام و نشانِ دہلی
میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

اس شعر کو سن کر مشاعرے میں اس سرے سے اُس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی روتے ہوئے لوگ ہنس پڑے، ہر چہرے پر شگفتگی آگئی اور حضرت غالب نے اپنے ہونہار پوتے احسن علی خاں شاداں کو گلے لگا کر پیار کیا" حمیدہ سلطان "مضمون مرزا باقر علی خاں کامل" احوالِ غالب۔ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد صفحہ ۲۸۴

کا غالب بڑا زندہ، توانا اور زرک زادہ شاعر ہے۔

غالب کا تصورِ حیات جس قدر دقت پسند ہے اتنا ہی دشوار گزار اور صبر طلب اُن کا تصورِ عشق ہے۔ ان کے یہاں ہمیں عشق مجازی اور حقیقی دونوں رنگ ملتے ہیں۔ انھیں کائنات کی ہر چیز سے محبت ہے گویا وہ حسن کا ایک وسیع تصور رکھتے ہیں۔ کائنات کے ہر ذرے میں انھیں نورِ ازل دکھائی دیتا ہے ہے وحدت الوجود کے مسلک پر پختہ ایقان کے سبب انھیں اس کا اقرار کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ خدا کے وجود کے سوا کسی کے قائل نہیں۔ اس صوفیانہ مسلک کے باوجود غالب نے بشری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے وہ انسان کی انسان سے محبت کے قائل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خدا اور کائنات کی محبت کو عشق کی معراج سمجھتے ہیں۔ غالب کا تصورِ عشق مادی، روحانی، مجازی و حقیقی سطح پر مل کر ایک وحدت بن گیا ہے مگر انھیں تنگ ظرفی، منصور بھی منظور نہیں۔ غالب کے نظریۂ عشق کی شدید انفرادیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر میں فرہاد کا عشق کم عیار ہے اس لئے کہ وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا یعنی اس کی موت تیشے کی رہین منت رہی۔ فرہاد کے مقابلہ میں غالب قیس کی دشت نوردی اور جنوں سامانی کے قائل ہیں۔ بعض موقعوں پر وہ قیس کو بھی اپنا "حریفِ مے مردافگنِ عشق" تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ ان کا عشق اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ آبلہ پائی کے لئے دشت و صحرا کی خاک چھاننی نہیں پڑے گی بلکہ ان کے لئے یہ عالم ہی سر بسر وادیٔ مجنوں ہے، ان کا ہر قدم بیابان صحرا ہے۔

اردو دیوان کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب کا خصوصی میدان شوخی و بانکپن ہے جس میں زمانے کی ہر کج ادائی کو مستی میں ٹال جانے کا دم خم ملتا ہے۔ کبھی تو تقدیر کی افتادگی کا بھی سہرے سے یہ کہہ کر انکار کیا جاتا

ہے کہ ع

گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو دل و جاں کی ارزانی بھی دیدنی ہے کہ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور دنیا کو زیر کرنے کا طریقہ ایک یہ بھی ہے کہ

انسان دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ ہر جا جہاں دیگر کی جلوہ آرائیوں کے باوجود میرے سر سری جہاں سے گزرنے کی بات کہی گئی ہے اور غالب کی نظر میں "اورنگ سلیماں" محض ایک کھیل اور دنیا بازیچۂ اطفال ہے۔

شوخی وظرافت کے پردے میں غالب نے حیات انسانی کے سینکڑوں مسائل کو چھیڑا ہے۔ زندگی کے سخت سے سخت مرحلے پر بھی ہمت ہارنے اور ہتھیار ڈالنے کی بات نہیں ملتی بلکہ ہر قدم پر یہ حوصلہ ملتا ہے ع

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

مسائل تصوف ہوں کہ معاملات عشق، اخلاقی مضامین ہوں کہ معاشرتی اور سماجی تقاضے ہر موقع پر غالب نے شوخی آمیز طنز و ظرافت سے وہ کام لیا ہے جو بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی سے بھی نہ بن پڑے۔ خدا کی بارگاہ میں بھی شوخی سے باز نہیں آتے اور وہاں پہنچ کر بھی یہ کہتے میں باک نہیں ے

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

غزل کا دائرہ غالب تک آتے آتے بے حد وسیع ہو گیا تھا۔ تہذیب و تمدن کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں غزل انسان کی داخلی زندگی کی ترجمان اور نقاد قرار پائی اور غالب کی غزل میں دونوں وصف ملیں گے یعنی وہ نقد حیات بھی ہے اور ترجمانِ شوق بھی۔ غالب نے کہیں کھل کر کسی فلسفے کی تبلیغ نہیں کی لیکن واردات قلب پر جب وہ حکیمانہ تبصرہ کرتے ہیں تو اس مخصوص رجحان کی

موجودگی میں غالب پر ایک فلسفی شاعر ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ غالب فلسفی نہ سہی ان کا رویہ فلسفیانہ ضرور ہے۔

شیخ محمد اکرام غالب کو فلسفی شاعر تسلیم نہیں کرتے اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ غالب نے کوئی مربوط فلسفہ نہیں پیش کیا ہے[۱] جبکہ مولانا شبلی کی نظر میں فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں اور اردو شاعری میں غالب کا کلام ان کی نظر میں فلسفہ ہے۔ "موازنہ انیس و دبیر" کے مقدمے کے آغاز میں شبلی رقمطراز ہیں۔

"فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بد مذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلایا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا ہجو و خوشامد کے سوا اور کچھ نہیں ہے میر تقی میر کی غزلیں درد کا تصوف غالب کا فلسفہ شاعری گنی جاتی ہے"[۲]

پروفیسر سید شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف "فلسفۂ کلام غالب" میں شیخ محمد اکرام کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ غالب کا فلسفہ ایک ناکام فلسفہ اور ان کا زاویہ نگاہ ایک منتشر زاویہ نگاہ ہے[۳] سید شوکت سبزواری کا استدلال یہ ہے کہ

..."غالب کے افکار میں حیات، کائنات اور اخلاق کے فلسفے کی تمامیت اور زاویہ نگاہ کی جامعیت پوری طرح آشکار ہے فلسفیانہ مباحث میں کائنات اور حیات دو اہم بحثیں ہیں ان کے تعلق سے اخلاق وجود میں آتا ہے۔ عصر حاضر کا مکمل نظام فلسفہ یہی ہے"[۴]

غالب کے رنگ تغزل میں بھی فلسفیانہ انداز کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ ان کے یہاں

---

[۱] ۔ شیخ محمد اکرام ۔ غالب نامہ صفحہ ۲۸۶

[۲] ۔ مولانا شبلی نعمانی ۔ موازنہ انیس و دبیر ۔ مقدمہ صفحہ الف مطبوعہ ۱۹۲۴ء

[۳] ۔ شیخ محمد اکرام ۔ غالب نامہ صفحہ ۲۸۶

[۴] ۔ شوکت سبزواری ۔ فلسفہ کلام غالب ۔ صفحہ ۲۱

یہاں محبوب کا تذکرہ یا واردات قلب کا بیان عشق کی بجائے عقل کے تابع نظر آتا ہے ۔
غالب کی شاعری کی ایک بڑی ہی نہیں بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فکر اور جذبہ دونوں کو یکساں طور پر تحریک میں لاتی ہے اور شاعر پر ایک بڑی ذمہ داری یہ ڈالتی ہے کہ اس کی نگاہ سطح سے الجھ کر نہ رہ جائے [۱]

عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ دعویٰ کہ ــــ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسرے دیوانِ غالب" [۲] دورِ جدید کے نقادوں کی نظر میں ایک عقیدت مندانہ غلو ہے لیکن اس قول کو حقیقت مان لینے میں عقل کو کیا تامل ہو سکتا ہے کہ جس طرح زمانہ وید کا مثل پیش کرنے سے قاصر ہے اسی طرح عالمی ادب میں دیوانِ غالب کا جواب ملنا بھی محال ہے ۔

ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ (محاسنِ کلامِ غالب) پر ہنوز تنقیدیں جاری ہیں لیکن ان کو اس حیثیت سے اولیت حاصل ہے کہ غالب کے تصوف اور فلسفہ پر باضابطہ بحث کی ابتدا انہی نے کی اور اس کے بعد یہ بحث چل پڑی کہ غالب صرف ایک فصیح اللسان شاعر ہی نہ تھے بلکہ رمز آشنا فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم بھی تھے ۔

غالب کے معاصرین میں سید غلام علی وحشت نے غالب کی زندگی ہی میں بڑے پتے کی بات کہی تھی ۔

> "اگر یہ شخص عرب کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعر میں متنبی یا ابوتمام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا" [۳]

---

[۱] سید احتشام حسین ـ مضمون "شاعری بادِ نفس اور نکہتِ گل" رسالہ شاعر غالب نمبر ماخوذ صفحہ ۵۳۶ ۔

[۲] عبدالرحمٰن بجنوری ـ محاسنِ کلام غالب (مقدمہ) صفحہ ـ ۵

[۳] خواجہ الطاف حسین حالی ـ یادگارِ غالب حصہ دوم صفحہ (۲۰۱)

رام بابو سکسینہ نے غالب کا مقابلہ انگریزی زبان کے شاعر براؤننگ اور جرمنی کے شاعر ہینے اور گیٹے سے کرتے ہوئے لکھا ہے۔

غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل اور ایک صوفی کی نگاہ دوربین، چابک دست مصور کا نازک ہاتھ ان کی صنعت پرکاری اور پرکاری صنعت ہے۔ حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔ ان کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تصنیف "افکار غالب" میں کلام غالب کے متضاد پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ آگہی بخشی ہے کہ غالب کے شعری موضوعات میں۔

"رندی و شاہد بازی بھی ہے، عشق حقیقی بھی ہے اور عشق مجازی بھی ہے۔ دین کا احترام بھی ہے اور دین سے تمسخر بھی ہے۔ اپنی شراب خواری پر افسوس بھی ہے اور اس کا جواز بلکہ تفاخر بھی ہے۔ وہ بقول خود زمین عشق بھی ہے اور ناگزیر الفت ہستی بھی ہے تسلیم و رضا کی تعلیم بھی ہے اور خدا کے ساتھ گستاخانہ شکایت اور جھگڑا بھی ہے ہستی کو ہیچ بھی سمجھتا ہے اور اس کی ہر لذت کے پیچھے مجنونانہ انداز میں دوڑتا بھی ہے گنہگاری سے بیزار بھی ہے اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد بھی چاہتا ہے۔۔۔ کبھی زندگی کی بعض کیفیتوں پر ایسی حکیمانہ نگاہ ڈالتا ہے کہ اس کا ایک ایک شعر حکمت کا ایک دفتر

---

[1] رام بابو سکسینہ تاریخ اردو ادب صفحہ (۴۰۱)

معلوم ہوتا ہے"۔ ^۱^

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو غزل کی کرشمہ سازی کے قائل نہ ہوتے ہوئے بھی غالب کی غزل گوئی کے معترف ہیں ان کی نظر میں غالب کی خوبی یہ ہے کہ

"غالب ایک خیال کو اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ حسن سے دوسرے خیالات کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن دوسرے خیالات کی جستجو میں محو ہو جاتا ہے گویا محشرستانِ خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے"۔ ^۲^

انیسویں صدی کے اس باکمال شاعر نے اردو میں صرف ریختہ گوئی کو اپنایا اور میر کی طرح رتبۂ بلند پر پہنچایا۔ غالب کی شخصیت کا حیرت خیز پہلو یہ بھی ہے کہ ریختہ گوئی کے تعلق سے کبھی یہ کہنے والا شاعر ع انچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است۔ وہی جب اس متاعِ ہنر کو دلپذیر بنا لیتا ہے تو پھر بزم ریختہ گویاں میں اس دعوے کے ساتھ مسند نشین نظر آتا ہے۔ ع

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب اردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس کے کلام کی شرحیں لکھی گئیں، اور یہ بات اس عہد کے کسی اور شاعر کے حصہ میں نہیں آئی۔ بقول مالک رام۔ "آج اردو دیوان کی کم و بیش تین درجن شرحیں ملتی ہیں" ^۳^ بےخود دہلوی اور نظم طباطبائی ان کے شارحین کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں رشید احمد صدیقی کے حسب ذیل بیان سے

---

^۱^ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ افکار غالب۔ صفحہ ۲۵۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

^۲^ پروفیسر کلیم الدین احمد "اردو شاعری پر ایک نظر" صفحہ ۶۳ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

^۳^ مالک رام "مضمون غالب شناسی: جب اور اب" عیار غالب مرتبہ مالک رام صفحہ ۲۶۵

بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

"غالب کے اردو کلام کی شرح لکھنے والوں میں مثلاً حالی، نظم طباطبائی، حسرت موہانی، نظامی، بیخود دہلوی، سہا مجددی، جعفر علی خاں اثر، جوش ملسیانی، نیاز فتح پوری، آغا محمد باقر اور بے شمار دوسرے اکابر کے فکر و نظر سے ہم روشناس و مستفید ہوئے" [۱]

۱۹۲۸ء میں پنجاب کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے دیوان غالب کا ایک مصور نسخہ شائع کر کے غالب فہمی کے لئے جہاں فن کارانہ راستہ اختیار کیا ہے وہیں رعنائی خیال کی مصوری نے جنت نگاہ کے سامان فراہم کئے ہیں۔

غالب کی موت پر لکھے جانے والے مرثیوں میں حالی کا مرثیہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ حالی نے اس نظم میں غالب کی شخصیت اور فن کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس مرثیہ میں انہوں نے غالب کو۔

"بلبل ہند، نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس، پاک دل، پاک صفات، بذلہ سنج، معشوق مزاج، رند مگر مرجع کرام و ثقات، روشن دماغ، شہر میں ایک چراغ، نقد معنی کا گنج داں، خوانِ مضمون کا میزبان، گل و بلبل کا ترجمان، رشکِ شیراز و اصفہاں وغیرہ سب کچھ کہا ہے" [۲]

---

[۱] پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ غالب کی شخصیت اور شاعری مضمون۔ اردوئے معلی غالب نمبر مرتبہ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۵ مطبوعہ ۶۹ء

[۲] حالی کے مرثیہ غالب کے چند منتخب اشعار

نثر حسن و جمال کی صورت

نظم غنج و دلال کی صورت

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۴۰ پر)

اردو شاعری، شہدائے کربلا کے مراثی سے ہٹ کر حالی کے اس مرثیہ کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حالی کے انی الضمیر کی بازگشت اگر کہیں سنائی دیتی ہے تو وہ وہ اقبال کی نظم غالب ہے[۲]

(سلسلہ صفحہ ۱۳۹ سے)

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی تصویر
اک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا
اس کے مرنے سے مرگئی دلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر ہوا

(کلیات حالی، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل)

[۲] اقبال کی نظم غالب ''___

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

باقی صفحہ (۱۴۱) پر

غالب نے عمر کے آخری ایام میں اپنی ساٹھ سالہ علمی و ادبی تخلیقات کا بڑی حسرت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے جن قلبی تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"..... ایک کم ستر برس دنیا میں رہا اب اور کہاں تک رہوں گا۔ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی دیوان دس ہزار کئی سو بیت۔ تین رسالے نثر کے یہ پانچ مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں عمر گنوائی" [۱]

اگر زمانے نے راحت و فراغت کے سامان مہیا کیے ہوتے تو غالب کی شخصیت علم و ادب کے حق میں خدا معلوم کتنی فیض رساں ثابت ہوتی۔

بسلسلہ صفحہ (۱۴۰) سے

ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

(بانگ درا۔ صفحہ ۷۷)

[۱] مرزا غالب۔ اردوئے معلّی۔ مکتوب بنام عبدالغفور نساخ۔ صفحہ ۱۹۷

۱۱

مکتوباتِ غالب

"سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں"

غالب نے اردو زبان کو ہزار بارہ سو بیت کا دیوان ہی نہیں دیا بلکہ وہ مکتوبات بھی بخشے جنھیں آج اردو کے جدید نثری ادب کا حرف آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے لکھتے وقت غالب کو گمان بھی نہ تھا کہ جو خطوط انہوں نے بے تکلف دوست احباب اور شاگردوں کو لکھے تھے کبھی ان کے اشاعت کی نوبت آئے گی۔ لیکن جب وہ شائع ہوئے تو ان خطوط کی ادبی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے بعد ہی سر سید کا اسکول اس نثر میں کھلا۔ غالب کے ایک ایک جملے پر داد ملی اردو نثر میں ہمواری آئی۔ غالب اپنی طرز کے پہلے اور آخری مکتوب نگار تسلیم کئے گئے[1]

غالب یوں تو ۱۸۴۹ء سے اردو میں خط و کتابت کر رہے تھے۔ پہلی بار جب ان کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ آپ کے ذاتی خطوط کا مجموعہ شایع کیا جائے تو وہ رضامند نہ ہوئے انھیں یہ عذر تھا۔

"کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کی شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے"[2]

---

[1] حامد حسن قادری۔ داستان تاریخ اردو۔ ماخوذ صفحہ (۲۴۶)

[2] مرزا غالب۔ اردوئے معلی۔ مکتوب بنام شیو نرائن۔ صفحہ (۲۵۰)

صرف دس سال گزرے ہوں گے کہ نہ صرف خطوط کی اشاعت کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی اس کام میں مدد دینے لگے اور چاہتے تھے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ خطوط انکی زندگی میں چھپ جائیں تاکہ وہ کتابت کی نفاست اور حسن طباعت کا بطور خود خیال رکھ سکیں۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام ایک مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے ان کے اشتیاق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا ان کی نقل بہ طریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ خط کا جواب وہی پارسل ہو"[1]

چنانچہ مکتوبات کا پہلا مجموعہ عود ہندی کے نام سے ۲۷/اکتوبر ۱۸۶۸ء میں یعنی غالب کی وفات کے چار ماہ پہلے شائع ہوا۔ اور دوسرا مجموعہ اردوئے معلیٰ جو غالب کی زندگی میں ترتیب پا چکا تھا مگر ان کے انتقال کے بعد ۶/مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہو سکا[2]

غالب سے پہلے اردو میں مکتوب نویسی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ویسے چٹھی وغیرہ قسم کی خط و کتابت جاری تھی۔ البتہ فارسی میں مکتوب نویسی کے بندھے ٹکے اصول تھے یعنی لکھنے والا جس قدر جانفشانی سے لکھے، پڑھنے کے لئے اتنی ہی علمیت اور ریاضت درکار ہوتی۔ اس کی عمدہ مثال سہ نثر ظہوری ہے فرد نویسی کی زبان فارسی ہی تھی[3] یادداشتوں کا رواج تھا۔ علمی تفریحی کلچرل جس قدر لٹریچر ہے وہ سب کا سب فارسی زبان ہی سے اردو میں آیا ہے۔ نثر عام طور پر کاروبار کی زبان ہوتی ہے جبکہ شاعری جذبات کی۔ اردو شاعری میں جب خاصہ دور گزر گیا

۱؎ مرزا غالب۔ اردوئے معلیٰ۔ صفحہ (۲۷۱)

۲؎ شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ ماخوذ صفحہ (۱۸۲)

۳؎ چنانچہ آج تک کائستھوں میں شادی کے موقع پر جو فرد سنائے جاتے ہیں انکی زبان فارسی ہی ہے۔ اس کو "رسم قشقہ" بھی کہا جاتا ہے۔

تب کہیں جا کر اردو میں نثر نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ ان کے ساتھ خط وکتابت بھی اردو زبان میں عام ہونے لگی ایسے دور میں غالب نے اپنی جدت پسندی اور جودتِ طبع کے ساتھ مکتوب نویسی کی ایک نئی طرح ڈالی اور یہ طرزِ تحریر جب خواص وعوام میں مقبول ہوئی تو خود غالب بھی اس کارنامے پر فخر کرنے لگی مرزا حاتم علی مہر کے نام ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں ۔

"مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" [۱]

گویا مکاتیب غالب نے نصف ملاقات کو پوری ملاقات کا لطف بخشا ہی نہیں بلکہ ان خطوط کی بدولت اردو میں پہلی بار فن مکتوب نگاری کا آغاز ہوا ۔

غالب نے پنج آہنگ کے آہنگ اول میں فارسی مکتوب نویسی کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن مکتوب نگاری کے باب میں غالب کا شروع ہی سے ایک خاص نقطۂ نظر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال کی جائے جو گفت وشنید میں ہوتی ہے ۔ فارسی میں ان کا حسب ذیل جملہ اس امر کا شاہد ہے ۔

"نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گزارش دور تر نہ بودہ، نوشتن را رنگ گفتن دہد" [۲]

غالب کے اردو مکتوبات کی جدت یہ ہے کہ طول طویل فارسی وعربی آمیز مقفیٰ ومسجع عبارت آرائی اور تعقید کی بجائے سادہ سلیس اور عام فہم انداز بیان کو اپنایا ہے ۔ زبان سادہ ضرور ہے مگر الفاظ کی دروبست یہ ظاہر کئے دیتی ہے کہ کسی کاریگر کی کاریگری ہے ۔

---

[۱] مرزا غالب ۔ اردوئے معلیٰ ۔ صفحہ ۲۵۳

[۲] شیخ محمد اکرام ۔ غالب نامہ صفحہ ۵۵

ہر چند سطروں میں طرز نگارش کی کوئی نہ کوئی خوبی نظر آجاتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ غالب کی جدت پسندی نے شاعری میں انھیں مشکل پسند بنایا کیونکہ عام روش آسان گوئی، روزمرہ اور محاورے باندھنے کی تھی اس کے برخلاف اس زمانے والے نثر مقفیٰ اور مسجع لکھتے تھے، غالب نے سہل نثر لکھنے کا انداز نکالا۔ ان خطوط کی نثر سادہ صاف اور بے تکلف ہے۔ غالب کا طرز تحریر صحیح معنوں میں سہل ممتنع ہے اس پر مستزاد غالب کی وہ طرز انشا ہے جس میں حسن بیان کی دلآویزی کے ساتھ شوخی آمیز ظریفانہ انداز بیان کی چاشنی بھی ہے جس میں خود ان کی شگفتہ بوقلموں شخصیت کی چھاپ ملتی ہے۔ مکتوبات غالب کے اوراق میں قلعہ معلی کی وہ ٹکسالی زبان محفوظ ہو گئی جس کو اردوئے معلیٰ کہا جاتا ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام

> "غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر انداز بیان سے وہ گلکاریاں کیں کہ اردوئے معلیٰ خواص و عوام کو پسند آئی اور اردو نثر کے لئے ایک طرز تحریر قائم ہو گیا جس کی پیروی دوسروں کے لئے لازم تھی" [1]

جدت پسندی اور دلفریب طرز تحریر کے علاوہ خطوط غالب جن مزید خصوصیات کے حامل ہیں ان میں راست انداز بیان، بلا واسطہ طریقۂ اظہار، جذبات نگاری، ظلفیت حقیقت طرازی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بلاغت، فصاحت، مکالمے کی زبان اختیار کرنا، مختلف موضوعات کو بیان کرنے کے لئے اسی لب ولہجہ کو اپنانا جو مخاطب کی دلچسپی کا باعث بنے، بے ساختگی کے باوجود حسن و زیبائش کا بے تکلف اظہار، نثر کی مختلف انواع کا پورا پورا خیال رکھنا، فکری توازن، شدید غیر معتدل جذبات سے بچنے کے لئے شوخی و ظرافت کا استعمال، لطف و دلکشی اور سادہ کاری کے سبب مکاتیب

---

[1] شیخ محمد اکرام غالب نامہ۔ صفحہ (۲۲۹)

غالب اردو میں فن مکتوب نگاری کی کسوٹی بن گئے۔ بقول رشید احمد صدیقی۔

"خط میں انشا پردازی کی تمام خوبی اور خامی منکشف ہوجاتی ہے۔ انشا پردازی کی نہیں اس انشا پردازی کی بھی۔ غالب نے کچھ اور نہ کیا ہوتا صرف یہ رقعات لکھے ہوتے تب بھی ہمارے وہ بہتوں سے اونچے ہوتے۔ خط لکھنے میں لوگوں نے بڑے بڑے اہتمام کئے ہیں۔ ساری قابلیت اور زور قلم صرف کیا ہے لیکن پڑھنے کے بعد یہی محسوس ہوا کہ خط بھی نہ لکھ پائے اور بے نقاب بھی ہو گئے۔" [1]

مکتوبات غالب کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے ہم نہ صرف ان کی شخصیت سے روشناس ہوتے ہیں بلکہ ان خطوط کے آئینہ میں ان کی دلّی اور اس عہد کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر زینت ساجدہ۔

"غالب کے خطوط پڑھیئے تو ایک دنیا نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ اردو نثر پر نادانستہ انہوں نے اپنے خطوط سے بڑا احسان کیا ہے۔ پرانی پر تکلف اور مصنوعی راہیں چھوڑ کر بے ساختہ انداز اسلوب نکالا ہے۔ اس وجہ سے ان کے خطوط آئینہ خانہ کا کام دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے خطوط ایک ایک کر کے سامنے سے گزرتے ہیں تو تصور میں ان کی تصویر کے رنگ صاف ہوتے ہیں ان کی دلی، ان کی حویلی، ان کے شاگرد، ان کے دوست محل سرا، خادم، بچے دنیا کی نا قدردانی۔ ان کی عالی حوصلگی پھر زمانے کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کام کرنا جو ان کی طبیعت

---

[1] رشید احمد صدیقی۔ نقد غالب۔ صفحہ ۳۲۴ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد

کے مناسب نہ ہو یہ سب باتیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں گ[1]

غرض خطوط کیا ہیں اپنے عہد کی معاشرتی دستاویز ہیں۔ ان مکاتیب میں غدر کی خون آشام روداد اس بلاغت سے رقم کر گئے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی ان بکھرے ٹکڑوں کی مدد سے ایک مربوط روزنامچہ غدر تشکیل دے سکے۔

غالب کے جتنے بھی خطوط ہم تک پہنچے ہیں وہ مختلف لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ مرزا ہرگوپال تفتہ، منشی شیونراین، نواب صاحب رامپور، میر مہدی مجروح، نواب علاؤالدین خاں علائی، مرزا حاتم علی مہر ان میں سے اکثر شاگرد ہیں، کچھ دوست، کچھ معتقد بھی اور کچھ سے خاندانی مراسم بھی۔ لیکن سب کے ساتھ خلوص اور ربط ایک جیسا ہے مگر لہجہ میں فرق مراتب کا بے حد لحاظ ہے۔ مرزا تفتہ اور میر مہدی مجروح کو جو خط انہوں نے لکھے ہیں وہ صرف ایک مہربان، مشفق اور چاہنے والا دل ہی لکھ سکتا ہے۔ انھیں اپنے شاگردوں سے بچوں کا سا خلوص تھا وہ ان کی مسرت و غم میں برابر کے شریک ہیں اور بستر مرگ پر بھی جب اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے ہاتھوں میں چھالے ہیں خط لکھنے سے باز نہیں آتے۔[2]

موضوعات کے اعتبار سے بھی مکتوبات غالب متنوع اور معلومات آفریں ہیں۔ اشعار پر اصلاح والے خطوط، جن میں فن شاعری کے بارے میں معلومات ہیں، بعض خطوط میں اپنے ادق اشعار کا مطلب سمجھاتے ہیں اور بعض میں ادبی مباحث ملتے ہیں۔ ایسے بیشتر خطوط ہندوستانی لغت نویسوں اور قاطع برہان کے قضیے کے ضمن میں لکھے گئے (بعض ٹھیٹ کاروباری قسم کے ہیں جیسے وظیفے کی پیروی اور اپنی کتابوں کی اشاعت کے ضمن میں لکھے گئے خطوط)

---

[1] ڈاکٹر زینت ساجدہ "غالب اپنے خطوط کے آئینے میں" رسالہ سب رس ۱۹۵۲ء۔ ص ۱۵

[2] مالک رام۔ ذکر غالب۔ ماخوذ صفحہ (۲۹۱)

بعض علمی استفسارات کا راست اور تشفی بخش جواب دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسیع المطالعہ آدمی ہیں۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک مکتوب کے حسب ذیل اقتباس سے غالب کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

"پیر و مرشد سلام نیاز پہنچے۔ کف الخضیب صور جنوبی میں سے ایک صورت ہے اس کے طلوع کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ اختر شناسان ہند کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں اور ان کی زبان میں اس کا نام بھی یقین ہے کہ نہ ہوگا۔ قبول دعا وقت طلوع منجملہ مضامین شعری ہے جیسے کتان کا پرتوماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے منگوایا اور قطعات زمرد اس کے محاذی چشم رکھے کچھ اثر نہ ہوا۔ ایران و روم و فرنگ سے انواع کتانی کپڑے منگوائے چاندنی میں پھیلائے مسکا بھی نہیں۔ تحویل آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے ۲۱/ مارچ کو واقع ہوتی ہے کبھی ۲۲/ کبھی ۲۳/ بھی آپڑتی ہے اس سے تجاوز نہیں۔"[1]

مرزا محمد عسکری نے عود ہندی اور اردوے معلیٰ کا ایک عمدہ انتخاب "ادبی خطوط غالب" کے نام سے شائع کیا ہے۔

خطوط غالب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معلومات دنیا سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انھیں حقیقت نگاری میں کوئی باک نہیں معلوم ہوتا مبارک باد، پرسہ، اظہار غم اور ہمدردی کے خطوط بھی اور نجی ہوتے ہوئے بھی سب کی پسند اور خاصہ کی چیز بن جاتے ہیں۔ پرسہ کا طرز بھی رسم و روایت کے باوجود تجربہ بن جاتا ہے رسم دنیا کو سمجھتے ہیں۔ اپنی معمولی کیفیتوں میں چاہنے والوں

---

[1] مرزا غالب۔ اردوے معلیٰ۔ ص ۱۳۱

کو شریک کر لیتے ہیں۔ خط میں اپنی شخصیت کو دوہری شخصیت سے منسلک و مربوط کر دیتے ہیں اس میں غصہ، خوشی، ہر جذبہ بالراست نظر آتا ہے۔ شعر میں یہی چیز بالواسطہ ہے۔ غالب کی طبیعت کا تضاد بھی ان ہی خطوط میں ملتا ہے جو بیک وقت امیر، فقیر اور قلندر ہے۔ فقیر ہے تو فقیر متکبر اور قلندر ہے تو ایسا قلندر جس کا ہر لمحہ دار و رسن سے گزرتا ہے۔ ان خطوط میں کہیں دلآزاری نہیں ہے۔ ان کی دوستی اور ان کے تعلقات ایسے تھے کہ ایک دفعہ قائم ہو جاتے تو آخر تک نبھائے جاتے مگر اس میں نہ کسی پر رعب ڈالتا ہے نہ خود مرعوب ہوتا۔ مکتوبات غالب کے آئینہ میں غالب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر زینت ساجدہ رقمطراز ہیں۔

"ان کے خطوط پڑھنے سے ان کی قدر و منزلت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان کی انسانیت اور انسان دوستی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ جس طرح ان کا کلام درجہ اول کی چیز ہے وہ بھی زندگی کی ہر حالت میں درجہ اول ہی کے انسان رہے کبھی انہوں نے اس مرتبہ سے اپنے کو نہیں گھٹایا جو انہوں نے اپنے لئے مقرر کر رکھا تھا"[1]

عود ہندی اور اردوئے معلی کی اشاعت کے ایک عرصہ بعد منشی امتیاز علی عرشی نے ۱۹۳۷ء میں خطوط غالب کا ایک اور مجموعہ "مکاتیب غالب" کے نام سے شائع کیا۔ یہ غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے نوابان رامپور کو لکھے تھے۔ حامد حسین قادری مکاتیب کے تعلق سے اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

"مکاتیب غالب کی اشاعت نے غالب کی سیرت کا

---

[1] ڈاکٹر زینت ساجدہ "غالب اپنے خطوط کے آئینے میں" رسالہ سب رس۔ صفحہ ۱۵

ایک نیا باب کھول دیا جو باب پہلے مجمل تھا اب اس کی شرح شائع کر دی" [۱]

نوابانِ رامپور کے نام لکھے گئے خطوط میں اکثر و بیشتر خطوط ایسے ہیں جو الحاح و التجا کی نذر ہو گئے لیکن حامد حسن قادری کے تبصرے کے مطابق اظہار حال اور فتح سوال کے اسالیب و تراکیب کو غالب کی جدت طرازی نے نوادر ادب بنا دیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے غالب کی تحریر کی بلاغت و فصاحت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے" [۲]

مکتوبات غالب کے مرتبین میں پروفیسر مہیش پرشاد کا نام اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے خطوط کو تاریخی سلسلہ سے ترتیب دیا پھر وہ خطوط بھی شامل کئے جو مختلف رسالوں میں چھپتے رہے اور ایسے خطوط بھی حاصل کئے جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح مکتوبات غالب کا ایک وقیع مجموعہ ترتیب پا سکا۔

---

[۱] حامد حسین قادری۔ داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۲۳

[۲] حامد حسین قادری۔ داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۲۴

کبیر نے بھی آسودگی کی تمنا کچھ اسی انداز میں کی تھی ؎

سائیں اتنا دیجئے جا میں کٹم سمائے
میں بھی بھوکا نا رہوں سادھو نہ بھوکا جائے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذہانت کے سوتے زمان و مکاں سے ماورا ہو کر کہیں نہ کہیں جا کر مل جاتے ہیں۔

مکتوبات غالب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عصری تحقیقات کی رو سے غالب کے اب تک کوئی آٹھ سو ستر خطوط محققین کو دستیاب ہو سکے ہیں [۱] ان خطوط نے مطالعہ غالب کو مختلف جہتوں سے وسعت بخشی ہے۔ آج ہم اس کے فارسی کلام کی قدر کرنے کے قابل ہیں تو اردو کلام کی معرفت اور اردو کلام کو سمجھنے اس کی صحیح داد دینے کے قابل ہیں تو اس کے اردو خطوط کی مدد سے ــــــ اگر ان خطوط کو اول تا آخر نظر میں رکھا جائے تو غالب کو اس کے ذہن و جستجو' اس کی تمنا کے پہلے اور دوسرے اور آخری کو پہچاننے میں غالب کا ابتدائی گراہی کا تسلسل نہیں ہو سکتا۔ ان کے بغیر غالب شخص و شاعر کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا ہے [۲]

بعض خطوط جو صرف دل بہلائی یا دوستوں کو خوش کرنے کے لیے لکھے گئے تھے جیسے مجروح' تفتہ اور حاتم وغیرہ کے نام ہیں ان میں وہ حیوان ظریف کھلتا ہے۔ بے تکلف شخصیت ملتی ہے۔ غالب کی شخصیت کے مطالعہ میں اس حیوان ظریف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی دریافت کا سہرا ابھی حالی ہی کے سر ہے۔ خوش خلقی اور زندہ دلی اس دور کی تہذیب کا مزاج تھے اور غالب کے یہاں ان صفات کی کمی نہیں تھی۔ شوخی اور ظرافت کا عنصر تو غالب کی سرشت میں داخل تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی نجی زندگی کے روزمرہ واقعات میں شوخی و ظرافت کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ ان کی شاعری میں اسی فطری شوخیٔ طبع کا رنگ جھلکتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موقع پر بھی وہ ظریفانہ انداز بیان کا جادو جگاتے تھے خواہ دوست احباب کی محفل ہو یا بہادر شاہ ظفر کا دربار معاملہ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی پیری مریدی کے شجرہ نویسی کا ہو کہ واسطہ

[۱، ۲] ظ انصاری مضمون غالب کے خطوط۔ ماخوذ ص (۲۴۰) مجلہ غالب

انگریز حکام کی دارو گیر سے۔ حتیٰ کہ خدا کے حضور میں بھی وہ اپنی فطری شوخی اور ظرافت آمیز سخن گستری سے باز نہیں آتے تھے۔ خوبی کی بات تو یہ ہے کہ غالب کے طنز و ظرافت میں بھی ادبیت کا رنگ ہوتا ہے۔

مکتوبات غالب میں ظرافت کی بے پناہ مثالیں سامنے آتی ہیں۔ لطیفے، چٹکلے مگر پھکڑ پن کہیں نہیں۔ ان کی شخصیت ہی ایسی گڑھی ہوئی ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں وہی معیار بن جاتا ہے جس سے مخاطب بھی خوش اور خود بھی خوش۔ اگرچہ یہ ظرافت صرف کچھ دیر کا بہلاوا ہے ورنہ اس پہ غور کرو تو معلوم ہوتا ہے خدا جانے دل پہ کیا گزری جو یوں ہنسنے کو جی چاہا۔ غم کو اس طرح ہلکا کرنا بڑے دل گردہ کا کام ہے۔ غالب نے زندگی میں کیا نہیں سہا ان پر کیا نہیں گزری لیکن وہ ہمواری جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے ان کی طبیعت میں بھی ہے۔

اردو میں شوخی و ظرافت کے لئے سودا اور انشا مشہور ہوئے لیکن سودا نے ہجو کا سہارا لیا ہے اور انشاء نے ریختی کا یا ہزل کا۔ غالب کی شوخی میں شائستہ ادبیت اور اسی درجہ کا شاعرانہ حسن ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی۔

"غالب سے پہلے تک اردو میں پھکڑ، مسخر گی اور ہجو وغیرہ کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن اعلیٰ طنز و ظرافت کے نمونے غالب کا کارنامہ ہیں اور انھیں کے عہد میں ملنے لگتے ہیں۔" [۵]

حامد حسن قادری بھی اس بات کے معترف ہیں کہ غالب نے طنز و ظرافت کو محض تفریح و تفنن طبع کا سامان نہیں بنایا اس سے اپنی زندگی میں بہت کام لئے ہیں۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

" آجکل مزاحیہ نگاری ایک علم و فن بن گئی ہے

---

[۵] رشید احمد صدیقی۔ مضمون کوئی بتلاؤ کہ ہم بتائیں کیا "نقد غالب" مرتبہ:۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص (۳۲۷)

لیکن یہ سب عقلی مزاح ہے اور غالب کی فطری ظرافت تھی۔
غالب کو اپنی فطرت سے بعض فائدے بھی حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ
طبعی زندہ دلی کے سبب سے وہ غم والم کو آسانی سے جھیل
جاتے تھے اور مصیبت کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے دوسرے یہ کہ
وہ ہنسی ہنسی میں بعض کام بنا لیتے تھے" [1]

طنز وظرافت اور شوخی طبع کے جو عمدہ نمونے ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی انشا پردازی کو ناقابل تقلید بنانے والا جوہر در اصل ان کا طنز آمیز ظریفانہ لب ولہجہ ہے ۔ جو ان کی طرز انشاء کو شوخ وشگفتہ بےباک اور طرحدار بناتا ہے۔ مکتوبات غالب سے اگر ایسی عبارتوں کو جمع کیا جائے تو اردو کے انشائیہ ادب میں ایک خاصے کی چیز متصور ہوگی ۔ انشا پردازی میں اب تک حسن بیان، برجستگی، اختصار اور جامعیت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ غالب نے پہلی بار اس کو طنز آمیز ظرافت سے روشناس کیا اور اپنی شوخ گفتاری سے ایک شگفتہ تحریر اور شائستہ مزاح کو رواج دیا۔ اس طرح غالب اردو ادب میں طنز ومزاح نگاری کے بانی قرار پائے۔ رشید احمد صدیقی غالب کی شخصیت کے اس اہم پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"اردو شعر وادب میں غالب طنز وظرافت کے (اصلی معنوں میں)
بانی ہوئے ہیں اور طنز وظرافت کے معاملے میں وہ اپنے عہد کے
ایرانی شعرا سے زیادہ ثقہ، شائستہ اور پرفن تھے ۔ اس کا
سبب ممکن ہے یہ ہو کہ غالب طنز وظرافت کا دار (ایرانی شعر کے
وطیرے کے خلاف) معمولی یا رواتی ادارہ یا شخصیتوں پر کرنے
کے اتنے شائق نہ تھے وہ اس کو اپنا ہدف نہیں بناتے جو خود زندگی

---

[1] حامد حسن قادری داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۳۱

اور زمانے کا ہدف ہوتا بلکہ براہِ راست اور بڑے اعتماد سے اس
کو مخاطب کرتے جس کی ہدف خود زندگی اور زمانہ ہوتا یعنی خالق
ارض و سما۔ یہ دلیل تھی فن اور فن کار دونوں کے عظیم المرتبت
ہونے کی۔" [۱]

اردو زبان و ادب پر غالب کا یہ احسان ہے کہ جو خصوصیت ان کی شخصیت کا ایک
جز و تھی وہ آگے چل کر اردو ادب کی ایک صنف قرار پائی۔ ان کے بعد ہی اردو میں طنز و مزاح
کے کئی دبستان کھلے۔ ایک دبستان کے سرخیل تو خود رشید احمد صدیقی ہیں جن کی طرز انشا میں
غالب کے لب و لہجہ کی شوخی شگفتگی اور شائستگی خون رگ حیات کی طرح جاری و ساری ہے۔
رشید احمد صدیقی نے اپنے تبصرے میں ایسے اداروں کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے اس میدان
میں غالب کا اثر قبول کیا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اودھ پنچ کے حلقہ کے اکثر لوگوں پر غالب کی طنز و ظرافت کا اثر
پڑا ہے۔ مثلاً اکبر و نواب سید محمد آزاد پر۔ اکبر ہی کے عہد میں اور یہ
زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی بیس سال ہے۔ جب طنز و ظرافت
کے معیاری نمونے اردو شعر و ادب میں عام ہو گئے جن میں شبلی، مولانا
ابوالکلام آزاد، سید محفوظ علی، مولانا محمد علی، ظفر علی خاں، ظریف لکھنوی
اور سجاد انصاری وغیرہ کے مضامین نظم و نثر ہیں۔" [۲]

غالب کی زندہ دلی اردو غزل پر بھی اثر انداز رہی۔ غالب نے غزل کے حزنیہ
لہجہ اور مزاج کو بدلا۔ اردو ادب پر غالب کی زندہ دلی کے دور رس اثرات کا تجزیہ کرتے
ہوئے لکھتے ہیں۔

"اپنی اس طبعی زندہ دلی سے انہوں نے خود غزل کے مایوس اور

---

[۱] رشید احمد صدیقی۔ مضمون کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ نقد غالب۔ صفحہ ۳۲۶
[۲] رشید احمد صدیقی۔ مضمون کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ نقد غالب۔ صفحہ ۳۲۷

حزنیہ لہجے کو کس حد تک پرامید اور عزم آفریں بنایا اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے اس ذہنی رجائیت ہی کی بدولت ادبی دھارے کا رخ موڑنا آسان ہوا ورنہ شاید میر کی زبان نہ غالب کے بیان کو سنبھال سکتی نہ اقبال کے پیام کو"[1]

غالب کی زندگی اور شخصیت کے مطالعہ سے ہی یہ آگہی ملتی ہے کہ غالب کی حس ظرافت دراصل ان کے عرفان غم کا ثمرہ ہے۔ اور ان کی شائستہ حس مزاح اس بات کی غماز ہے کہ دلّی کی تہذیب نے شخصیت کے مختلف رجحانات کو کیسے نکھارا تھا جس طرح غزل میں ایک آدھ شعر حاصل غزل ہوتا ہے اسی طرح اس تہذیب دلی کی حاصل شخصیت غالب تھی۔

مکتوبات غالب کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں ہم اس غالب سے روشناس ہوتے ہیں جو بقول ڈاکٹر زینت ساجدہ۔

"جو شاعری میں اپنے کو دیر یاب بناتا ہے دستیاب نہیں بناتا۔ اپنی فکر جس تنقالی رکھتا ہے وہ دوسروں تک اتنے ہی واضح اور آسان طریقے سے پہنچاتا ہے۔ شخصی زندگی اور عوامی زندگی یعنی خلوت اور جلوت کا جدا جدا رنگ ہوتا ہے۔ غالب کی اندرونی اور گھریلو شخصیت خطوط ہی میں ظاہر ہوتی ہے، شاعری میں افراسیابی شخصیت ملتی ہے یعنی وہ ترک جو باہر سے زرہ بکتر ہے مگر خطوط کا غالب زم لوٹا کا ہوا تشنہ و محروم ہے جو رو بھی سکتا ہے اور گنگنا بھی سکتا ہے۔ شعر میں شخصیت چھپائی رہتی ہے لیکن خطوط میں شخص کا پتہ چلتا ہے"[2]

---

[1] رشید احمد صدیقی مضمون "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ نقد غالب۔ مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد۔ ص ۳۳۱

[2] ڈاکٹر زینت ساجدہ مضمون "غالب اپنے خطوط کے آئینے میں" رسالہ سب رس صفحہ (۱۷)

غالب کے خطوط ان کی شاعری اور شخصیت کی تفسیر اور ان کے عہد کی ہو بہو تصویر ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیتوں کے ترجمان بھی۔ ان ہی خطوط کی روشنی میں ہم ان کے دل و دماغ فکر اور جذبۂ عقائد اور عمل میں تصادم کو دیکھ سکتے ہیں جو بیک وقت زمانہ کا سماج کا اور عصری تقاضوں کا شعور رکھتا ہے اس انفرادیت کی گہرائی اور گیرائی کو بھی ہم سمجھ سکتے ہیں جو پوری اجتماعیت میں اپنی انفرادیت کو منوا لیتی ہے اور یہی اجتماعیت اس منفرد شخص کے اردگرد گھومتی ہے۔

اس پورے عہد کی دلی ان ہی خطوط میں سانس لے رہی ہے۔ غالب کی موت پر حالی نے سچ ہی کہا تھا کہ ان کے مرنے سے مر گئی دلی۔

○

حالی کا یہ مرثیہ غالب کی شخصیت کے ہر پہلو کو اُجاگر کرنے میں مددگار ہے
اسی نے شاید بہت سوں کو غالب شناسی پر مائل کیا ہے اس لئے اس کو
یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔

مرثیہ مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی تخلص بہ غالب

۱۲۸۵ ہجری ۔ مرتبہ خواجہ الطاف حسین حالی

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی — وقت کوتاہ و قصّہ طولانی
عیشِ دُنیا سے ہو گیا دل سرد — دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزمِ سُلطانی
ہے سراسر فریبِ وہم و گماں — تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب — جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی — حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی — اک تماشا ہے حُسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مُشتِ خاک کے بدلے — گر ملے خاتمِ سُلیمانی

بحرِ معنی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی — اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر — تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اِس کی — صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حَظِّ وصل سے محروم — جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس — جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے — شان جس میں دلربائی کی
جنس کاسدت نا روا تر ہے — خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس — آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاح — رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل — دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اسکا تھا اور اُس کی دوات

تھیں تو دلّی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلّی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یہاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یہاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پستِ مضمون ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں — نظر آتی تھی حال کی صورت

اسکی توجیہ سے بگڑتی تھی — شکل امکاں محال کی صورت
اسکی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اُس کا مآل کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازشِ خلق کا تحمل نہ رہا — رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع — رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا — دوشِ احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی — اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکین — ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
تلخیٔ غم کہی نہیں جاتی — جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر — ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا — خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن — اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار — کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اس کا — گرم بازار گلرخاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا — قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہلِ ہند اب کریں گے کس پر ناز — رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نامِ ملوک — بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھیرائیں اب مدارِ سخن

کیا ہے جس میں وہ مردِ کار نہ تھا — اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا — پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسین — سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن — قطعہ ۱ — درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا

ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا — ۲ — جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب ہمنے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شانِ حسنِ فطرت تھا

معنٔی لفظ آدمیّت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیتِ حَزَن ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئین اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

حد تھی اک بیاں میں رنگینی کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رُماں میں

لب جب دہیاں ہوا خاموش گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

گوش معنی شنو ہوا بے کار مرغ کیوں نعرہ زن ہے بُستاں میں

وہ گیا جس سے بزم روشن تھی شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت

آبِ حیوان پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون

ہمنے جانی ہے اُس سے قدرِ سلف اُن پر ایماں لائیگا اب کون

اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے اس کو دل سے بھلائیگا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون

اُس سے ملنے کو یہاں ہم آتے تھے جاکے دلّی سے آئیگا اب کون

مرگیا قدرداں فہمِ سخن شعر ہم کو سنائیگا اب کون

مرگیا تشنۂ مذاقِ کلام ہمکو گھر سے بلائیگا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک ہم کو چالیں بتائیگا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی

غزل اس کی بنائے گا اب کون
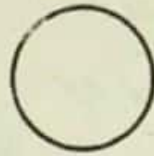
کتابیات

تصنیف	نام مصنف	سنہ اشاعت
۱۔ آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۱۹۶۵ء
۲۔ یادگارِ غالب	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۸۹۷ء
۳۔ آثار الصنادید	سر سید احمد خاں	۱۹۶۵ء
۴۔ گلشن بے خار	مصطفےٰ خاں شیفتہ مترجم محمد احسان الحق	۱۹۶۲ء
۵۔ عودِ ہندی	مرزا غالب	۱۹۳۰ء
۶۔ اردوئے معلیٰ	مرزا غالب	۱۹۳۰ء
۷۔ دیوانِ غالب	مرزا غالب	۱۸۹۷ء
۸۔ محاسن کلام غالب	عبدالرحمٰن بجنوری	۱۹۵۲ء
۹۔ افکار غالب	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۱۹۵۴ء
۱۰۔ کلیاتِ حالی	مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل	
۱۱۔ موازنۂ انیس و دبیر	مولانا شبلی نعمانی	۱۹۲۴ء
۱۲۔ گذشتہ لکھنو	مولوی عبدالحلیم شرر	۱۹۶۵ء
۱۳۔ مضامین فرحت	مرزا فرحت اللہ بیگ	
۱۴۔ تذکرہ غوثیہ	گل حسن	
۱۵۔ غالب نامہ	شیخ محمد اکرام	۱۹۳۰ء
۱۶۔ غالب	غلام رسول مہر	۱۹۳۶ء

کتاب	مصنف / مرتب	سال
۱۷ - ذکرِ غالب	مالک رام	۱۹۶۴ء
۱۸ - احوالِ غالب	مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد	۱۹۵۳ء
۱۹ - نقدِ غالب	مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد	۱۹۶۵ء
۲۰ - عیارِ غالب	مرتبہ مالک رام	۱۹۶۹ء
۲۱ - فلسفۂ کلامِ غالب	شوکت سبزواری	۱۹۴۶ء
۲۲ - غالب (انتخابِ کلام)	پروفیسر محمد مجیب	۱۹۶۹ء
۲۳ - غالب سیمینار	مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۹۶۹ء
۲۴ - غالب اور آہنگِ غالب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۹۶۸ء
۲۵ - غالب شناسی	ظ - انصاری	۱۹۶۹ء
۲۶ - کلیاتِ غالب (فارسی) جلد اول	مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	۱۹۶۹ء
۲۷ - مجموعۂ نثرِ غالب	مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	۱۹۶۷ء
۲۸ - تاریخ اردو ادب	رام بابو سکسینہ	۱۹۶۹ء
۲۹ - جہانِ غالب	کوثر چاندپوری	۱۹۶۳ء
۳۰ - سوانح امیر مینائی	نواب فصاحت جنگ جلیل	۱۳۴۷ھ
۳۱ - مغلوں کے ملک الشعراء	نبی ہادی	۱۹۷۸ء
۳۲ - تاریخِ داستانِ اردو	حامد حسن قادری	۱۹۵۷ء
۳۳ - تنقید اور عملی تنقید	پروفیسر احتشام حسین	۱۹۵۲ء
۳۴ - اردو شاعری پر ایک نظر	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۹۶۰ء
۳۵ - داغ	تمکین کاظمی	
۳۶ - بانگِ درا	علامہ اقبال	
۳۷ - یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۱۹۵۵ء
۳۸ - مفتی صدر الدین آزردہ	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی	۱۹۷۷ء
۳۹ - قاطع برہان و رسائل متعلقہ	قاضی عبدالودود	۱۹۶۷ء

رسائل

١- رسالہ شاعر غالب نمبر	مرتبہ اعجاز حسین	١٩٦٩ء
٢- رسالہ سب رس		١٩٥٣ء
٣- رسالہ نقوش آپ بیتی نمبر	مرتبہ محمد طفیل	١٩٥٩ء
٤- ماہنامہ آجکل	دسمبر	١٩٨٠ء
٥- اردوئے معلی غالب نمبر	مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	١٩٦٩ء
٦- مجلہ غالب نامہ (سہ ماہی)	مدیر اعلیٰ پروفیسر نذیر احمد	١٩٨٤ء